طلوعِ اسلام

بیادِ اقبالؒ

مئی ۱۹۴۹

ایک روپیہ

یہ خبر آپ نے پہلے نہیں سنی

ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنا پبلشنگ ھاؤس

قائم کیا ہے

جس کی طرف سے بلند پایہ کتابیں شائع کرنے کا بھی انتظام کیا جائے گا

اور جو بہترین ذوق کی کتابیں بھی مہیا کریگا

ان کتابوں کی ایک مختصر فہرست الگ شائع کی جارہی ہے۔ ان میں سے کوئی کتاب

یا ان کے علاوہ جو کتاب آپ کو درکار ہو

طلوعِ اسلام پبلشنگ ہاؤس کو لکھئے

کتاب آپ کے پاس پہنچ جائیگی۔ آپ نے کہیں سے تو کتاب منگانی ہی ہے۔ یہیں سے کیوں نہ منگائیں۔ معاملہ میں آپ کو ہر طرح کا اطمینان رہے گا اور پبلشنگ ہاؤس کو اس سے کچھ فائدہ پہنچ جائے گا۔

پتہ نوٹ کر لیجئے۔ یہی پتہ اب دفتر طلوعِ اسلام کا بھی ہے۔

خود تشریف لانے والے یوں سمجھ لیں کہ خالق دینا ہال سے صدر کی طرف آئیں تو ہیمک سینما کے پاس ایک بڑی سڑک ہے۔ اس کو رابسن روڈ کہتے ہیں۔ اس سڑک پر چند قدم آگے بڑھ کر خیام ہوٹل کے سامنے پبلشنگ ہاؤس واقع ہے۔

ناظم طلوعِ اسلام پبلشنگ ہاؤس رابسن روڈ کراچی۔

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

کراچی

مرتب
محمد یونس

قیمت تحفہ جدید
ایک روپیہ

سالانہ ۔۔۔۔ دس روپے
ششماہی ۔۔۔۔ چھ روپے

فہرست

زندہ رود	علامہ اسلم جیراجپوری	۱
لمعات	۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۳
تلمیحاتِ اقبال	محترم ممتاز حسن صاحب	۴ - ۱۳
بقیہ تلمیحاتِ اقبال	۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۵۵
۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء	۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۱۷
مملکتِ جدید پر اقبال کی تنقید	محترم یوسف حسین خاں صاحب	۳۱
شعرا کو خطاب	جناب قرشی صاحب	۵۱
سرودِ رفتہ	علامہ اقبالؒ	۵۳
کارنامۂ اقبالؒ	جناب اسد ملتانی	۵۶
نشانِ منزل	علامہ اقبالؒ	۵۷
اقبال اور قرآن	محترم جناب پرویز صاحب	۶۱
نقد و نظر	۔ ۔ ۔ ۔ ۔	۹۷
وارداتِ مقاصد	جناب اسد ملتانی	

زندہ رود

(حکیم الامت۔ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی زندۂ جاوید کتاب جاوید نامہ کے مطالعہ کے بعد علامہ اسلم صاحب جیراج پوری مدظلہ العالی نے اپنے تاثرات چند درخشندہ اشعار میں قلمبند فرمائے تھے چونکہ علامہ مرحوم نے اس کتاب میں اپنے آپ کو "زندہ رود" کے نام سے مخاطب فرمایا تھا اس لئے اس نظم کا عنوان بھی "زندہ رود" رکھا گیا تھا۔ یہ نظم اولیں "یوم اقبال" (جنوری ۱۹۳۸ء) میں پڑھی گئی جو مقبول عام ہوئی۔ "زندہ رود" آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس رود کے زندہ جاوید ہونے میں کسے کلام ہو سکتا ہے کہ اقبال اس پیکر خاکی کا نام نہیں جو زیر زمین مدفون ہے بلکہ اس آفتاب حقیقت کا نام ہے جو ظلمت کدۂ عالم میں آج بھی اسی طرح ضیا پاش ہے جیسے پہلے تھا کہ اس آفتاب نے اللہ کی کتاب مبین سے اکتساب نور کیا تھا۔ اقبال کی حقیقت ایک اقبال شناس اور قرآن دان کی زبان سے سنئے۔)

طلوع اسلام

اے کہ ذات تست ملت را چراغ　　اے کہ شعر تست فردوس دماغ
اے کہ در ساز تو نوائے زندگی　　خوش سرودی نغمہ ہائے زندگی
آتشے از سوز خود افروختی　　جان ما افسردگان را سوختی
صبح ادراکت جہان او شگافت　　شاعری در ذات تو معراج یافت
در خیال خود گذشتی از فلک　　تا شدی انباز با حور و ملک
وانسوئے گردوں جہانیدی سمند　　تا بزیر پایۂ عرش بلند
نور حق را در تلاطم دیدۂ　　خویشتن را اندراں گم دیدۂ
عشق را تازہ برات آوردۂ　　یعنی پیغام حیات آوردۂ
شرح دادی عالم موجود را　　وانمودی منزل مقصود را
گفتۂ تو مغز جان شاعری　　پرتوی تازہ جہان شاعری

اے کہ از آب بقائی زندہ رود
بر روانی ہائے تو از من درود!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

طلوعِ اسلام، حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کی یاد میں شائع ہو رہا ہے اور اس کا مقصد ان کے پیامِ حیات آفریں کی نشر و اشاعت ہے۔ اس لئے اس کا ہر نمبر اقبال نمبر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے آج تک کوئی الگ اقبال نمبر شائع نہیں کیا۔ بایں ہمہ اقبال سے متعلق کچھ مضامین ایسے تھے جنھیں قارئین طلوعِ اسلام تک پہنچانا ضروری تھا۔ اس کے لئے مناسب سمجھا گیا کہ اشاعت زیرِ نظر میں انھیں یکجا شائع کر دیا جائے۔ اور چونکہ یہ پرچہ اپریل سے متعلق ہے جو حضرت علامہ کی وفات کا مہینہ ہے (کہ ان کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو ہوئی تھی) اس اعتبار سے اس اشاعت کو اشاعتِ خصوصی بہ یادِ اقبال کہا جا سکتا ہے۔

طلوعِ اسلام اشخاص پرستی کو مٹانے اور حقائق پرستی (کہ جو درحقیقت خدا پرستی کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ حقیقت وہی ہے جو خدا کی طرف سے ملتی ہے) کو عام کرنے کے لئے مشہود ہوا ہے۔ اس لئے جب یہ اپنے آپ کو اقبال سے منسوب کرتا ہے تو اس سے مراد ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی، بار ایٹ لا نہیں جو سیالکوٹ میں پیدا اور لاہور میں دفن ہوئے۔ بلکہ اس سے مقصود اقبال کا وہ پیغام ہے جس نے دس مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دیا اور راہ گم کردہ کاروانِ ملت کو از سرِ نو نشانِ منزل سے آگاہ کر دیا۔

پھر اس پیغام سے بھی ہمیں صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ یہ درحقیقت قرآن کا پیغام ہے جسے اقبال نے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس لئے پیغامِ اقبال کی نشر و اشاعت سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس طرح مسلمانوں کو قرآن سے قریب تر لایا جائے اور انھیں اس چشمۂ حیات سے از سرِ نو متعارف کرایا جائے جس میں حقیقی زندگی کا راز مستور ہے۔ لہٰذا اقبال ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں بلکہ ایک مقصدِ عظیم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ نہایت کامیاب، جاذب اور دلکش ذریعہ۔ خود اقبال کے الفاظ میں

غزل سرایم و پیغام آشنا گویم بایں بہانہ دریں بزم آشنا جویم

ورنہ طلوعِ اسلام کو اشخاص سے کیا تعلق اور شاعری سے کیا واسطہ!

نغمہ کجا و من کجا! ساز سخن بہانہ ایست سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کے الفاظ کو یاد رکھا اور اس طرح یاد رکھا کہ اس کی نظیر دنیا کی کسی اور قوم میں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اس کے مفہوم و معانی کو جس طرح سے بھلایا ہے اس کی مثال بھی شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ صدر اول کے بعد جو قرآن نگاہوں سے اوجھل ہونا شروع ہوا ہے تو رفتہ رفتہ وہ غیر اسلامی تصورات کے غلافوں میں اس طرح چھپ گیا جیسے چاند گہن میں آجائے۔ صدیاں اسی طرح گذر گئیں اور پھر یہ حالت ہوگئی کہ یہی غیر اسلامی تخیلات، عین اسلام بن گئے۔ اب مسلمانوں سے ان معتقدات کو چھڑانا جو انھیں اسلاف سے وراثت میں ملے تھے، ان کی نگاہ میں انھیں دین سے بیگانہ بنانا تھا۔ ادھر یہ حالت تھی، ادھر یورپ کے میکانکی تصورِ حیات کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے نوجوان طبقہ کے دل و دماغ سے ماورائے عقل (یعنی وحی) کی ضرورت اور اس کے تاثرات کو خس خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا شروع کر دیا اور اس طرح ان کی نگاہوں کا زاویہ بدل دیا۔ مذہب پرست طبقہ اپنی جگہ نوحہ کناں تھا کہ نوجوان طبقہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں بلکہ متنفر ہوتا جا رہا ہے اور نوجوان طبقہ شکوہ سنج تھا کہ جس چیز کو ان کے سامنے حقیقت و بصیرت کہکر پیش کیا جا رہا ہے اس سے ان کی فطرت ابا کرتی ہے۔ غرضیکہ ـــــ مسجد میں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے ـــــ اور وہ بے نمازوں کو شکایت تھی کہ نمازیوں میں۔ وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے ـــــ مذہب کے مدعیوں کو ہر مقام پر شکست ملتی تھی اس لئے کہ قرآن کریم میں تو یہ جوہر موجود ہے کہ انسان علم و عقل اور تجارب و مشاہدات کی جن بلندیوں تک بھی چڑھتا جائے، قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا۔ لیکن جن عجمی تصورات کو قرآن کہہ کر پیش کیا جا رہا تھا وہ تو انسانی دماغ کی کاوش ہی کا نتیجہ تھے۔ ان میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو سکتی تھی کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ غرضیکہ دنیائے اسلام عجیب پیچ و تاب میں تھی اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے کہ ایسے میں مبدا فیض کی کرم گستری نے ان میں ایک ایسی گراں مایہ ہستی کو پیدا کر دیا جس کی نگاہ دوربیں نے انسانی تخیلات کے تو بر تو پردوں کو قرآن کریم سے ہٹا کر عروس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اور وہ اسلام جو مدت ہائے دراز سے عجمی افسانوں کی چیستاں بن چکا تھا، پھر سے اپنی فطری حالت میں پہچانا گیا۔ خدائے ذوالمنن کی موہبت کبریٰ سے اس ہستی کو دماغ ایسا عطا ہوا جو علم و حکمت کے بلند ترین مقام تک پہنچ چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی قرآن کی محبت نے اس کے سینہ میں وہ قلب روشن رکھ دیا جسے صہبائے ایمان کا شفاف آبگینہ کہنا چاہیئے۔ ان دونوں کے امتزاج سے، وہ نگاہ پیدا ہوئی جو ہزار پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت کو بھی بے نقاب دیکھ لے۔ اس نگہ حقیقت شناس کا نام تھا۔ ۔ اقبال۔

جب سے مسلمانوں میں مرکزیت فنا ہوئی تھی ان کے ہاں بھی دین اور دنیا دو الگ الگ شعبے قائم ہو چکے تھے جس طرح عیسائیت میں کلیسا اور سلطنت اور ہندوستان میں گرہست آشرم اور سنیاس آشرم تھا مسلمانوں کے

نزدیک بھی دنیا ایسی قابلِ نفرت شے بن چکی تھی کہ ہر محراب و منبر سے یہ آواز بلند ہوتی تھی کہ دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ نظریہ یکسر غیر اسلامی ہے۔ قرآن اپنے ماننے والوں کے لئے ایک مکمل دستورِ حیات پیش کرتا ہے۔ ایک ایسا نظامِ زندگی مرتب کر کے دیتا ہے جو ان کی ہر قدم پر راہنمائی کرتا ہے۔ سیاست، مذہبیت، عمرانیت، سب دین ہی کی شاخیں ہیں۔ یوں سمجھیے کہ دنیا کا ہر وہ کام جس کی بنا تقویٰ پر ہو عین دین ہے۔ پھر اقبال نے اس حقیقت کو محض ایک نظری اور اجمالی حیثیت ہی سے پیش نہیں کیا بلکہ دنیا کے ہر نظامِ زندگی کے تجزیہ کے بعد بتا دیا کہ اس میں کیا کیا خرابیاں ہیں اور اسلامی نظام کس طرح انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کا واحد اور مکمل ذریعہ ہے۔

دین کے متعلق یہ غلط نظریہ بھی رائج ہو چکا تھا کہ اس سے مقصود محض انفرادی نجات ہے، ملت کے اجتماعی معاملات "دنیاداروں" کے لئے ہیں۔ یہ عملی رہبانیت کا تصور تھا جو مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اقبال نے آکر بتایا کہ انفرادیت کی زندگی کبھی اسلامی زندگی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم ایک ایسا نظام پیش کرتا ہے جس میں ہر فرد ملت کا ایک زندہ رکن ہے۔ انفرادی اصلاح اس لئے ضروری ہے کہ ان افراد کے مجموعہ سے جو قوم بنے وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ لیکن اگر افراد کے سامنے اجتماعی تصورِ حیات نہیں تو وہ لاکھ اصلاح یافتہ ہوں، مقصدِ زندگی سے بہت دور ہوں گے۔ اسلام جماعت ہے اور جماعت نام ہے ایک نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا۔ یہ نظام مرکز سے قائم ہوتا ہے اور مرکزِ ملت وہ ادارہ ہے جو قرآنی احکام کی تنفیذ و ترویج کا ذریعہ بنتا ہے۔ اسی کو "خدا کی بادشاہت" کہتے ہیں۔ یعنی قرآنی نظامِ مملکت۔

دین کے متعلق یہ تصور بھی ذہنوں میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ عبادات و اعمال کے نتائج محض اخروی زندگی میں جا کر مرتب ہوں گے۔ ثواب نام رہ گیا تھا ایک ایسے مبہم تصور کا جس کی کوئی محسوس توجیہ اس زندگی میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اقبال نے آکر بتایا کہ قرآن کی رو سے اعمالِ صالحہ سے مفہوم یہ ہے (بلکہ یوں کہیے کہ اعمال کا فطری اور لازمی نتیجہ یہ ہے) کہ وہ انسان میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ موجودہ زندگی میں عزت و وقار، شوکت و حشمت، دولت و ثروت، حکومت و سلطنت کی زندگی بسر کرے اور اس کے بعد کی زندگی میں وہ تمام کامیابیاں اور کامرانیاں نصیب ہوں جو انسانی آرزوؤں کی منتہیٰ ہیں۔ اعمال و عبادات اگر یہ نتائج مرتب نہیں کرتے تو سمجھ لیجئے کہ اس طریق کار میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور ہے۔ اور وہ خرابی یہ ہے کہ آج وہ نظامِ زندگی مفقود ہے جس کے اندر رہتے ہوئے یہ اعمال حقیقی معنوں میں اعمالِ صالحہ بنتے تھے۔

پھر مذہب کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو چکا تھا کہ مذہب جتنا کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اس کے بعد کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مذہب کے متعلق مزید تحقیق و اجتہاد سے مسائلِ زندگی کا ایسا حل تلاش کرے

جو زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی لیکن مسلمان ایک ماضی پرست قوم بن کر زندگی کی دوڑ میں صدیوں پیچھے رہ گئے۔ اقبال نے یہ بتایا کہ دین کے مکمل ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ضروریاتِ زندگی کے متعلق سینکڑوں برس پیشتر ایک خاص ماحول اور خاص معاشرہ کے پیشِ نظر جو جزئیات مرتب ہوئی تھیں وہ ابدی طور پر غیر متبدل رکھی جائیں گی۔ بلکہ ختمِ نبوت اور اکملیت دین سے مقصود یہ ہے کہ اصولی طور پر انسانی تقاضوں کی تسکین کے لئے جو کچھ درکار تھا وہ وحی کے ذریعہ انسانوں تک آچکا ہے اس میں کسی ردوبدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اب ان اصولوں کی روشنی میں اپنے اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق، فرعی مسائل کا حل الگ الگ مستنبط ہوتا رہے گا۔ یورپ اس لئے تباہ ہوا کہ اس کے پاس مسائلِ حیات کے حل کے لئے کوئی ایسا غیر متبدل ضابطۂ آئین نہ تھا جو فطرتِ انسانی کی محکم بنیادوں پر قائم ہو۔ اور مسلمان اس ... لئے تباہ ہوئے کہ انھوں نے بدلتے رہنے والے فرعی مسائل .... سے متعلق احکام کو بھی غیر متبدل سمجھ لیا۔ ماضی سے تمسک اس لئے مفید ہے کہ جو علمی سرمایہ ہمارے اسلاف ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں اس کی مدد سے ہم اپنے مستقبل کو درخشندہ و تابناک بنائیں۔ نہ یہ کہ ماضی تو درخشندہ اور روشن رہے اور مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے۔

ایک طرف اقبال نے مذہب پرست طبقہ کے سامنے دین کے حقائق پیش کئے جن کی رو سے وہ اسلام جو ایک عرصہ سے متاعِ گم گشتہ ہو چکا تھا، پھر سے آنکھوں کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف انھوں نے یورپ کے مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے روکنے کی فکر کی۔ یورپ، بزعم خویش، ہر نظریہ کو علم و عقل کی روشنی میں پرکھنے کا مدعی تھا اور اس نظرِ فریب، خوش آئندہ دعوے کے ماتحت وہ مسلمانوں کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مذہب سے برگشتہ کئے جا رہا تھا۔ ہمارے مذہب پرست طبقہ کے پاس، اس الحاد و بے دینی کا علاج سوائے فتاوائے کفر کے اور کچھ نہ تھا کہ نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا کہ دشمن کا مقابلہ اس قسم کے ہتھیاروں سے کرو جو اس کے پاس ہوں۔ اقبال، حکمت و فلسفہ کی ان بلندیوں تک پہنچ چکا تھا کہ خود اہلِ یورپ اسے ائمہ فن میں سے تسلیم کرتے تھے۔ ان ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے قرآن کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس طرح یورپ کی مادہ پرستی کی دھجیاں فضائے آسمان میں بکھیر دیں۔ اس نے بتایا کہ وہ دین فطرت جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے کس طرح عین علم و بصیرت ہے اور وہ ظن و قیاس جسے یورپ علم و بصیرت سمجھ رہا ہے، کس طرح جہل و ظلمت۔ یورپ کی مادہ پرستی اسے اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے، اس کے بعد فنا ہے۔ لہٰذا فردی زندگی کا عقیدہ ایک واہمہ ہے۔ اقبال نے اسی نظریہ ارتقاء کے مسلمات سے اس حقیقتِ عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ موجودہ زندگی سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ ایک آنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو بڑھتی چلی جائیگی۔ اقبال نے

اس قرآنی نظریۂ حیات کو علمی انکشافات کی روشنی میں پیش کرکے صرف یورپ کی مادہ پرستی ہی کا استیصال نہیں کیا بلکہ تمام نوع انسانی پر اس کا احسان ہے کہ اس نے انسانیت کو اس کی صحیح قدر و قیمت سے متعارف کرکے انسان کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا کہ وہی انسان جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے بعد مٹی کا ایک تودہ بن کر رہ جاتا تھا، اب ایک ایسی حیاتِ جاوداں کا پیکر بن گیا کہ موت اس کے نزدیک ایک شبِ تاریک کے بعد نورانی صبح کے طلوع کا نام ہو گیا۔ جب زندگی کے متعلق یہ یقین ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان میں اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس سے دنیا میں عدل و انصاف قائم رہ سکتا ہے۔

یورپ کے نظریہ مادہ پرستی نے ایک اور بھی ہلاکت آفریں خرابی پیدا کر رکھی ہے۔ مادہ پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر شے کی قدر و قیمت مادیت کے میزان ہی سے متعین کرتا ہے۔ جب کوئی کمزور و ناتواں کسی صاحبِ قوت سے امداد کا طالب ہوتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ کاروباری نقطۂ نگاہ سے اس کمزور کی مدد کرنا زیادہ منفعت بخش ہے یا اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اسے ہڑپ کر جانا زیادہ سود مند۔ وہ دنیا کے ہر معاملہ کو اسی "کاروباری میزان" سے تولتا ہے اور جو شکل اسے زیادہ منفعت بخش دکھائی دیتی ہے، اسے بلا تامل اختیار کر لیتا ہے۔ یورپ کا جدید "ضابطہ اخلاق" (کہ اگر اسے "اخلاق" کہا جا سکے) اسی اساس پر قائم ہے اور دنیا آج جس جہنم سے گذر رہی ہے وہ اسی اصل و اساس کا فطری نتیجہ ہے۔ اقبال نے آکر بتایا کہ یہ ضابطۂ معاشرت ابلیسانہ مکر و فریب کا جال ہے۔ وہی معاشرت دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کا موجب بن سکتی ہے جو وحدتِ خالق کے ایمان کی بنا پر وحدتِ خلق کے محکم اساس پر استوار ہو۔

مادہ پرستی کی اس لعنت سے ایک اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ چونکہ مادیت سے انسان کی نگاہیں ہمیشہ محسوسات میں گھری رہتی ہیں اس لئے انسانوں کی تقسیم محسوس حدود و قیود کی رو سے کی جاتی ہے اور زبان، رنگ، نسل، یا وطن کی تفریق سے انسانی جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ وہ جہالتِ کبریٰ ہے جو آج انسانیت کی امن سوزی کی سب سے بڑی ذمہ دار ہے۔ اقبال نے آکر دنیا کے سامنے قرآن کی اس بلند حقیقت کو پیش کیا کہ یہ "تقسیم انسانیت" کس درجہ تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس نے بتایا کہ قرآن کی رو سے تمام انسانوں کی تخلیق نفسِ واحدہ سے ہوئی ہے اور ان کی وجہ تکریم ان کے جوہر ذاتی ہیں نہ کہ نسبی تعارف۔ لہٰذا انسانی جماعت کی تشکیل اسی معیار کے مطابق ہونی چاہئے۔ اس نے سیاست حاضرہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ساری دنیا سے پکار کر کہہ دیا کہ جب تک تمہارا نظریۂ قومیت نہیں بدلتا دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی قرآنی نظریۂ تقسیم انسانیت کی رو سے اس نے ہندی مسلمانوں کی سیاست کا رخ لندن اور سومنات سے کعبہ کی طرف پھیر دیا اور نہایت بلند آہنگی سے برملا کہہ دیا کہ ــــ بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے ــــ اسی الگ نظریۂ قومیت سے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا سوال پیدا ہوا جس نے آج پاکستان کی جیتی جاگتی شکل اختیار کر لی ہے۔

دامنِ اس کا اپنوں اور بیگانوں کے ہر شئوم ارادہ سے محفوظ رکھے اور اسے قرآنی نظام کی ترویج و تنفیذ کا گہوارہ بنائے کہ یہی اُس مردِ درویش کی آہِ سحری اور نالۂ نیم شبی کا مقصود تھا)۔

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک حقیقی اقبالؒ کی۔ وہ اقبالؒ جو اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا تھا بلکہ ہر مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرتا تھا۔ ہم اقبالؒ کو نہ معصوم سمجھتے ہیں نہ اس کے فکر و اجتہاد کو منزہ عن الخطا۔ وہ قرآن کا ایک طالب العلم تھا اور ساری عمر طالب علم رہا۔ اس لئے اس کے فکری نتائج حرفِ آخر بھی نہیں ہو سکتے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کی عظمت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ کا حل قرآن کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس تلاش میں وہ کسی غیر قرآنی فکر کا منت کش نہیں ہوتا تھا کہ اس کا مسلک یہ تھا کہ

از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

جب تک اقبالؒ کا صحیح مقام متعین نہ کیا جائے سمجھ میں نہیں آسکتا کہ اقبالؒ کو فطرت نے کس مقصدِ عظیم کے لئے پیدا کیا تھا اور اس مقصد کو اس نے کس حد تک پورا کیا۔ وہ یہ سمجھانے کیلئے نہیں آیا تھا کہ زمینِ شعر میں گلکاریاں کس طرح کی جاتی ہیں بلکہ وہ یہ بتانے کے لئے آیا تھا کہ یہ زمین کس طرح بدل سکتی ہے۔ یہ آسمان کس طرح بدل سکتا ہے؛ اور مسلمان کو اس کی عظمتِ گم گشتہ پھر سے کیسے مل سکتی ہے۔ محسوسات کے خوگر انسان کی نگاہیں جب لطیف حقیقتوں کے حسنِ بسیط سے پورے طور پر بہرہ یاب نہیں ہو سکتیں تو وہ پردہ ہائے مجاز کی ان رنگینیوں میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں جو اس حقیقت کو مشہود بنانے ہوتی ہیں شاعری دراصل وہ حسین و جمیل نقاب تھی جس کے اندر حقیقی اقبالؒ چھپا بیٹھا تھا۔ عام لوگ (اور ہم میں خواص ہیں کتنے!) ان پردوں کے نقش و نگار میں محوِ تماشا ہو کر رہ جاتے ہیں اور ان کے اندر بیٹھا ہوا اقبالؒ ان ظاہر بیں نگاہوں کی فریب خوردگی پر ہنس دیتا اور کبیدہ مسوس کر رہ جاتا ہے۔

پوچھا جائے گا کہ اقبالؒ نے کام کیا کیا تھا؟ یہ سوال پھر اس طبقہ کی طرف سے اٹھیگا جس کی نگاہیں محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، وہ طبقہ جو غالبؔ کے الفاظ میں "اوج طالع لعل و گہر" کے بجائے کسی کے "جوہر طرف کلاہ" کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ جو کسی کی عظمت کا اندازہ اس سے لگاتا ہے کہ اس نے اینٹوں اور پتھروں کا کتنا بڑا انبار جمع کیا تھا۔ جو کسی کی شان و شوکت کیلئے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی گاڑی کے آگے کتنے گھوڑے جتتے تھے۔ کتنے ہاتھی اس کے جلوس میں نکلتے تھے۔ یا آگے بڑھے تو کتنا وسیع پنڈال اس کی آمد کی تقریب میں تعمیر ہوتا تھا۔ کتنے لاکھ انسان اس کے گرد و پیش "زندہ باد" کے نعرے لگاتے تھے۔ جو لوگ کسی کے اعمالِ حیات کو صرف انہی میزانوں سے تولنے کے خوگر ہیں، ان کے لئے اس سوال کا جواب فی الواقعہ بڑا مایوس کن ہوگا۔ لیکن جن کی نگاہیں محسوسات سے گذر کر حقایق کو پہنچتی ہیں وہ بلا تکلیف و کاوش دیکھ سکتے ہیں کہ اقبالؒ نے کیا کیا؟ کسی کی دنیا بدلنے کے لئے یہ مہمل ہوتا ہے کہ اس کے مکان کا نقشہ بدل دیا جائے، ضرورت اسکی ہوتی ہے کہ اس کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا جائے۔ اس کا نظریہ

زندگی بدل دیا جائے کہ

اگر بگاہ تو دیگر شود جہاں دگر است

اقبال نے اپنے طریقِ کار میں اسی روش کو اختیار کیا جس سے ہنگامہ آفرینیوں اور غوغا آرائیوں کے بجائے چپکے چپکے دلوں کی بستیاں بدل جایا کرتی ہیں۔ اقبال نے کشتی کا رخ بدلنے کی بجائے پانی کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس نے اشیا کا رنگ تبدیل کرنے کے بجائے نگاہوں کے چشمہ کا رنگ بدل دیا۔ اس نے جسموں کو نہیں چھوا بلکہ دلوں کو بدل دیا۔ اقبال نے کیا کیا! اس کا صحیح جواب جلاح سے پوچھنا چاہیے تھا؟

لیکن بایں ہمہ اقبال اپنی زندگی کے مشن کا ایک خاکہ تیار کر کے دے سکا۔ اس میں رنگ بھرنے کا کام باقی رہ گیا۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ لیکن اسے اور کچھ کرنے کی مہلت نہ دی گئی اور اس کی تمام تر ذمہ داری اس تیرہ بخت قوم کے سر عائد ہوتی ہے جس میں وہ پیدا ہو گیا اور جس کے درد میں وہ عمر بھر تڑپتا رہا۔ وہ گوہرِ نایاب اس بازار میں آگیا جہاں کوئی اس کی صحیح قدر و قیمت سے واقف نہ تھا۔ اگر اس کی عمر کو بڑھانا کسی کے بس میں نہ تھا تو یہ تو قوم کے بس میں تھا کہ اسے اتنی فرصت بہم پہنچا دی جاتی کہ وہ اپنا مشن پورا کر جاتا۔ وہ اپنے لئے زندگی بسر کرنے نہیں آیا تھا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کا دماغ اسے بہت سی دولت پیدا کر کے دے سکتا تھا۔ لیکن وہ دوسروں کی خاطر جینے اور انہیں زندگی کا پیغام دینے کے لئے آیا تھا۔ وہ دوسروں کی خاطر جیا اور دوسروں ہی کی خاطر اس نے اپنی جان دیدی۔ مگر اس جوہر ناشناس قوم کو قطعاً اس کا احساس نہ ہوا کہ خدا کی کتنی بڑی نعمت نایاب یوں ہاتھوں سے چھن رہی ہے۔ لیکن جو کچھ ضائع ہوا اسے تو چھوڑیئے۔ جو کچھ وہ قوم کو دے گیا ہے اس کی کونسی قدر ہو رہی ہے؟ وہ اپنی کم فرصتی اور بے سازوسامانی کے باوجود اتنا کچھ قوم کو دے گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس سے ارضِ پاکستان کو ایک ایسی جنت بنایا جا سکتا ہے جو ساری دنیا کے لئے مثالی دنیا بن سکے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اس متاعِ گراں بہا کے امین آج کون ہیں! انہوں پر گانے والے قوال اور میلوں میں ناچنے والی طوائفیں! یا ان دونوں کا مجموعہ جسے اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کا ترجمان' یعنی ریڈیو پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اقبال کی وفات کو گیارہ برس ہو گئے! سوچئے کہ اس گیارہ برس کے عرصہ میں قوم نے اس کے پیغام کی نشر و اشاعت اور عملی تشکیل کے لئے کیا کچھ کیا؟ سال بھر کے بعد مختلف شہروں میں "اقبال ڈے" جو "عرس" کی رسمِ کہن کی ایک جدید شکل (Modern Form) سے زیادہ کچھ نہیں اور اس تقریب پر بھی سوائے اس کے کہ قوالیوں اور مشاعروں سے گرمیِ محفل کا سامان بہم پہنچا دیا جائے۔ اور کیا ہوتا ہے[1] اجب قوم کا یہ حال ہے تو .... قوم کی حکومت کا کیا پوچھنا! بات

[1] ہمیں اطمینان تھا کہ اس سال کم از کم کراچی میں "یوم اقبال" نہیں منایا جا رہا اس لئے یہاں کی فضا ان خرافات سے بچی رہیگی جن سے وہ سال گزشتہ متعفن ہوئی تھی۔ لیکن دو ہی دن ہوئے کہ ایک اشتہار سامنے آگیا جس کا عنوان ہے "ایک روپیہ" اور جس کی تفصیل ہے۔ تقریب یوم اقبال۔ ۲۳ اپریل ۔ قوال ۔ ۲۴ اپریل مشاعرہ ۔ اور مزید سامانِ کشش یہ کہ حضور گورنر جنرل پاکستان الحاج خواجہ ناظم الدین صاحب بھی اس تقریب سعید و محمود میں شرکت فرمائیں گے ۔ اقبال نے جب کہا تھا کہ

مرا اے کاش کہ مادر نزادے

تو اسی قسم کی [illegible] کے تخاطب سے مجبور ہو کر کہا تھا۔ واضح رہے کہ اس قوالی کے اشتہارات ہوائی جہاز کے ذریعہ سے کراچی میں [illegible]

۱۲۷۶

چھوٹی سی ہے لیکن نتیجہ کے اعتبار سے کتنی بڑی! تشکیلِ پاکستان کے بعد پچھلے سال پہلا یومِ اقبال آیا تھا۔ حکومت پاکستان نے کہ جسے فی الواقعہ اس مردِ مومن کی بصیرتِ قرآنی کے صدقے میں یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں، اگرچہ شہر میں غالب کی آبرو کیا تھی۔ اقبال کی یومِ وفات کی تعطیل تک اپنی فہرست میں نہیں رکھی تھی۔ قارئین طلوعِ اسلام کو یاد ہوگا کہ طلوعِ اسلام نے اس باب میں اربابِ حکومت سے کس طرح خط و کتابت کی اور کتنی جد و جہد کے بعد ۲۰ر اپریل کی شام کو ۲۱ر اپریل کی تعطیل کا اعلان کروایا۔ اس اعلان کے سلسلہ میں حکومت پاکستان کے محکمہ امورِ داخلہ کی طرف سے ہمیں مکتوب موصول ہوا تھا وہ شاید قارئین کی یاد سے اب تک نہ اترا ہو۔ اس میں مذکور تھا کہ

حکومت مرکزیہ پاکستان نے فیصلہ کیا ہے کہ نظریۂ پاکستان کے لئے علامہ اقبال کے بے مثال عطایا کی یاد میں ۲۱ر اپریل کو تمام دفاتر بند رہیں گے۔ (چٹھی نمبر ۱۵۷ پبلک۔ مورخہ ۲۰ اپریل)

ہمیں اس سے اطمینان ہو گیا تھا کہ خیر اور کچھ نہیں تو حکومتِ پاکستان کم از کم اس تقریب پر اپنے اس محسنِ عظیم کی یاد اسی طرح ہر سال تازہ کر لیا کرے گی۔ لیکن ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سالِ رواں کی فہرست تعطیلات میں یومِ وفات کی تعطیل پھر کہیں دکھائی نہ دی۔ اس پر ہم نے طلوعِ اسلام میں بھی لکھا اور الگ چٹھی لکھ کر بھی حکومت مرکزیہ کے محکمہ امورِ داخلہ کی توجہ پھر اس سہو کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن حکومت نے اس مرتبہ "نظریہ پاکستان کے لئے علامہ اقبال کے بے مثال عطایا" کو اس قابل ہی نہیں سمجھا کہ ان کی یاد میں تعطیل کر دی جائے۔ یہ اس حکومت کی حالت ہے جس کی فہرست تعطیلات میں حسبِ ذیل تقاریب موجود ہیں۔

بند تعطیلات	اختیاری تعطیلات
دلہنڈی	نیا سال
جنم اشٹمی	بسنت
دسہرہ	شوراتری
دیوالی	ہولی
گڈ فرائی ڈے	گرو گوبند سنگھ کا جنم دن
بادشاہ کا جنم دن	گرونانک سنگھ کا جنم دن۔
کرسمس ڈے	باکسنگ ڈے
	ایسٹر منڈے۔

یعنی ہمارے اربابِ حکومت کے خیال میں، ہولی۔ دلہنڈی۔ دیوالی۔ دسہرہ۔ بسنت۔ شوراتری۔ گرو گوبند سنگھ کا جنم دن۔ ایسی تقاریب ہیں جن کی یاد قائم رکھنے کے لئے دفاتر میں تعطیل کر دی جائے۔ لیکن اقبال کا یومِ وفات قطعاً اس قابل نہیں کہ اس کی یاد میں ایک دن کے لئے دفاتر بند کر دیئے جائیں۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ قائداعظم کی وفات کی تعطیل کب تک ان کی فہرست میں شامل رہتی ہے! اس احسان ناشناس قوم سے کچھ

بھی بعید نہیں!! ہم جانتے ہیں کہ ایک دن کی چھٹی سے اقبال کی یاد قائم نہیں ہو جاتی نہ ہی اقبال اس کا محتاج ہے۔ اقبال کا دوام تو جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہے۔ اس کی قدر آنے والی نسلیں کریں گی۔ ہماری نسلیں! کسی اور قوم کی نسلیں جنہیں زندگی کی قدر ہوگی۔ اس تعطیل سے صرف قوم کے جذبۂ سپاس گذاری کا مظاہرہ مقصود تھا۔ سو کسی سے بار بار کر احسان منوانا، اس کے احسان نہ ماننے سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا اس کا گلہ بے سود۔ ویسے کیفیت یہ ہے کہ روزنامہ ڈان کے "اقبال کی یاد میں ضمیمہ خصوصی" کے اجرا پر محترم خواجہ ناظم الدین صاحب نے ایک پیغام دیا ہے جس میں وہ روزنامہ مذکور کو اس کی اس سعی و کاوش پر مبارکباد دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ڈان کی یہ کوشش ہمارے اس مفکر اعظم کی یاد میں ایک قلیل سی نذر ہے جس نے ہمیں پاکستان کا تصور عطا فرمایا۔ اقبال اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کیلئے زندہ نہ رہا لیکن اب کہ پاکستان ایک حقیقت بن چکا ہے۔ ہم اس پیغام حیات بخش کی یاد کو، جو اس نے اس برصغیر کے مسلمانوں کو دیا تھا، جذبۂ احسانمندی سے تازہ کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان کو ایک عظیم اور ترقی یافتہ مملکت بنانے میں تمام کوششیں اقبال کی تعلیمات سے ہمیشہ فیض یاب اور حرکت گیر ہوتی رہیں گی۔

یہ ہے جناب گورنر جنرل کی طرف سے اعتراف احسانمندی اور وہ ہے ان کی حکومت کی طرف سے اس کی عملی تردید! یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ محکمہ امورِ داخلہ کے وزیر محترم خواجہ شہاب الدین صاحب نے کہ تعطیلات کا مسئلہ جن سے متعلق ہے، ۲۱ اپریل کو مرقدِ اقبال پر اپنی عقیدت کے پھولوں کی چادر بھی چڑھائی۔ ادھر یہ ادھر یہ۔ معلوم نہیں یہ فیصلے کہاں ہوتے ہیں اور کیسے ہوتے ہیں۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش!

پچھلے سال حکومت نے بڑا کرم کیا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ اقبال اکاڈمی کے قیام کے لئے اپنے میزانیہ میں رکھ لیا۔ ہم بھی اقبال اکادمی کی بنیادی کمیٹی کے ارکان کی طرح اس خوش فہمی میں مبتلا رہے کہ یہ عطیہ ایک لاکھ سالانہ کا ہے۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ سالانہ عطیہ نہیں۔ بس ایک ہی دفعہ کا ہے۔ (سنا ہے کہ اب پچیس ہزار روپیہ سالانہ کی الگ منظوری بھی ہو گئی ہے)۔ لیکن اس کے بعد سوال یہ ہے کہ اس ایک لاکھ یکمشت، یا پچیس ہزار سالانہ سے اقبال اکادمی کرنا کیا چاہتی ہے۔ ایک سال کے بعد بنیادی کمیٹی کی تجاویز کی ایک مختصر سی روئداد اخبارات میں آئی ہے لیکن وہ تو از قبیلِ شاعری ہی ہے۔ جو شخص یا ادارہ اقبال کے متعلق کوئی حقیقی کام کرنا چاہتا ہے اس کے لئے سب سے پہلے ایک بنیادی حقیقت کو سمجھ لینا اور سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اور وہ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے قرآن کو پیش کیا تھا۔ لہٰذا اقبال کے متعلق صرف وہی لوگ کچھ کہہ سکنے اور کر سکنے کے قابل ہیں جن کی نگاہیں اقبال اور قرآن پر ہیں۔ قرآن کے بغیر نہ اقبال کو سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کے پیغام سے صحیح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ خواہ حکومت کرے خواہ قوم۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ایسے اربابِ فکر و نظر کو، جن کی نگاہ اقبال اور قرآن پر ہے، ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور ان کو گذارش

کی جائے کہ وہ اقبال اور قرآن کی روشنی میں

(۱) قوم کے بچوں کے لئے، از اول تا آخر، ایک مکمل نصاب تجویز اور مرتب کر دیں۔

(۲) ہمارے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر، ایک ضابطہ قانون مدون کر دیں۔

(۳) اسلام کے متعلق ایسا لٹریچر تیار کر دیں جسے دنیا کے ارباب فکر و نظر کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ اور

(۴) دنیا کے مسلمانوں کو قرآنی مرکز پر لانے کے لئے مختلف اسلامی ممالک میں بھیجنے کے لئے وفود کی تربیت و تشکیل کریں۔

(۵) اقبال کی ایک ایسی مستند سوانح حیات مرتب کریں جس میں اسے نہ تو عالم ملکوت کا اعجوبہ بنا کر پیش کیا جائے اور نہ ہی مغرب زدہ فلسفی، بلکہ اسے ایک جیتا جاگتا۔ چلتا پھرتا انسان دکھایا جائے اور اس کے تدبر و تفکر کے نتائج بلا کم و کاست دنیا کے سامنے لائے جائیں۔

اس قسم کے ایک مرکزی ادارہ کا قیام، اقبال کی سب سے بڑی یادگار، قرآن کی سب سے بڑی خدمت اور وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں لکھی ہے!

قسمت بادہ باندازۂ جام است ایں جا

اشاعت زیر نظر چونکہ تمام و کمال، اقبال سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے اس لئے بہت سے دیگر مضامین جو طلوع اسلام میں التزاماً شائع ہوتے تھے، اس دفعہ سامنے نہیں آ سکے۔ مراسلات میں اکثر مکاتیب، استفسارات میں کئی ایک اہم سوالات اور "اسباب زوالِ امت" (ایک اہم سوال) کے جوابات جو اس وقت تک موصول ہوئے ہیں، منتظر اشاعت ہیں۔ نیز قارئین عالم اس التوا پر ہم کاتبین اور قارئین دونوں سے معذرت خواہ ہیں۔

علامہ اقبالؒ کی جو تصویر زینت دوش سرورق ہے، وہ آپ کے سفر افغانستان کی یادگار ہے۔ اور پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔ اس کے لئے ہم، بالواسطہ محترم خان بہادر ممتاز حسن صاحب قزلباش، وزیر ریاست خیرپور کے، اور بلاواسطہ محترم ممتاز حسن صاحب، معتمد طلقہ، شعبہ مالیات، دولت پاکستان کے رہین کرم ہیں۔

ڈاک کے انتظامات ابھی تک تسلی بخش نہیں اس لئے خریداروں کی طرف سے شکایت بدستور اور ہم حیران کہ اس کے بعد اب کیا کریں؟ آپ ہماری مجبوریوں پر نگاہ رکھئے اور ہم سے تعاون نہ چھوڑیئے۔ رفتہ رفتہ حالات بہتر ہو جائیں گے۔

ڈاک خانہ نے اب طلوع اسلام کے پوسٹ کرنے کے لئے ہر مہینہ کی ۵، ۱۰، اور ۱۵ تاریخ مقرر کی ہے۔ اس لئے ۵ سے پہلے اور ۱۵ کے بعد پرچہ روانہ نہیں کیا جا سکے گا۔ مطلع رہیے گا۔

تلمیحاتِ اقبال

مفکرینِ مغرب

(محترم ممتاز حسن صاحب جائنٹ سکرٹری منسٹری آف فنانس کی ریڈیائی تقریر)

اقبال اور مفکرینِ مغرب کا باہمی تعلق اس قدر گہرا ہے کہ کسی اور ایشیائی شاعر یا فلسفی کو نصیب نہیں ہوا۔ اس تعلق کے دو پہلو ہیں۔ ایک طرف تو اقبال یورپ کے ادب و فلسفے اور تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے طالب علم ہیں۔ اور دوسری طرف اس فلسفے اور تہذیب کے سب سے بڑے ناقد بھی ہیں، اور اقوامِ مشرق کو ان کا یہ مشورہ کہ:-

بایدایں اقوام را تنقیدِ غرب

ان کے پیغام کا نہایت اہم جزو ہے۔ تہذیبِ مغرب کے متعلق ان کے تاثرات ان کے سارے کلام میں پھیلے ہوئے ہیں۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی		یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دکاں نہیں ہے		جسے کھرا تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال		مرد بیکار و زن تہی آغوش

اقبال کی تصنیفات میں مفکرینِ مغرب کے افکار اور اقوال عام طور پر محض تلمیحات یا اشارات کے طور پر وارد نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اقبال کے ذہنی اور روحانی پس منظر کا ایک مستقل حصہ ہیں اور اقبال کے کلام کا بیشتر حصہ انہی افکار سے دست و گریباں ہے۔ انھوں نے مفکرینِ مغرب سے بہت کچھ سیکھا ہے اور جو سیکھا ہے اس کی خوب جانچ پرکھ کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مغربی ادب اور فلسفے کا تذکرہ محض تلمیحاتی نہیں ہے۔ بلکہ ایک بنیادی عنصر ہے۔ اقبال کے ذہنی اور روحانی ارتقا میں مشرق اور مغرب کا جو حصہ ہے اسے خود اقبال نے واضح کیا ہے۔

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

چونکہ اقبال کے پیغام کا ماحصل عقل و خرد کی پرستش نہیں، بلکہ عشق و ایمان کی پیروی ہے، اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال پر مغرب کا بھی وہی احسان ہے جو مشرق کا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اگر اقبال کو مغربی مفکرین اور مغربی تہذیب و تمدن کے مطالعے کا موقع نہ ملتا، تو ان کے فلسفے اور تعلیم کا رنگ وہ نہ ہوتا، جو ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس صورت میں اقبال اقبال ہی نہ ہوتے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر سب سے پہلے جو یورپین اثر پڑا، وہ سرطامس آرنلڈ مرحوم کا تھا۔ آپ گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے، اور اگرچہ خود کسی خاص طرزِ فکر کے حامل نہیں تھے، مگر علم اور علمی تحقیق کے میدان میں بلند درجہ رکھتے تھے، ان کی صحبت نے اقبال کے علمی ذوق کی خوب پرورش کی اور مغربی مفکرین سے اقبال کے تعلق کی بنیاد یہی تھی۔ اقبال نے آرنلڈ کے ولایت واپس چلے جانے پر 'نالۂ فراق' کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے، اس سے استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات کے خلوص کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں ‏ ‏ آہ مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سرزمیں

ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت ‏ ‏ اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

اقبال ۱۹۰۵ء میں ولایت تشریف لے گئے اور انگلستان اور جرمنی میں تین سال کے قیام کے بعد واپس آئے۔ اس عرصہ میں انھوں نے یورپ کے ادب فلسفے اور تہذیب کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اور اس مطالعہ نے ان میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی۔ مغربی تہذیب و تمدن نے اپنے آپ کو ان کے سامنے بے نقاب کیا اور انھوں نے دیکھا کہ اس تہذیب کا ظاہری حسن و جمال ایک فریب سے زیادہ نہ تھا اس انکشاف کے بعد ان کے دل میں اسلامی اقدار کے علاوہ کسی اور قدر کے لئے جگہ نہ رہی، مگر وہ اہلِ یورپ کے علمی تجسس اور علمی تحقیق کے ہمیشہ معترف رہے۔ اور یورپ کے ادب و فلسفے کا مطالعہ انھوں نے آخر وقت تک جاری رکھا۔

اقبال کے کلام میں پورے کے پورے مغربی فلسفے اور مختلف یورپین زبانوں کے بہترین ادب کے اثرات ملتے ہیں۔ مفکرین میں کانٹ، ہیگل، شوپن ہار، نیٹشے، کارل مارکس، برگساں، میک ٹیگرٹ، الگزنڈر، برٹینڈ رسل، آئن سٹائن، اور شعرا میں بائرن، گوئٹے، شیکسپیئر، پیٹوفی، دانتے وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اقبال کے تصورِ خودی کی تشکیل میں شاید میک ٹیگرٹ کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ میک ٹیگرٹ کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر اور اقبال کے استاد تھے۔ ان کے فلسفہ میں 'انا' یا 'Ego' کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے، اور انھوں نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ ایک 'انا' دوسرے 'انا' سے قطعاً جدا اور متمیز ہے۔ اور دو 'انا' کا ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا ناممکن ہے۔ یہی تخیل اقبال کی 'خودی' میں بھی موجود ہے، اگرچہ اقبال نے اس بنیاد پر جو عمارت قائم کی ہے اس کا میک ٹیگرٹ کے فلسفے سے تعلق نہیں۔

دوسرا یورپین مفکر جس نے اقبال کے فلسفے پر اثر اندازی کی ہے نیٹشے ہے۔ نیٹشے اور اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اگرچہ ابھی تک اس مضمون کا پورے طور سے احاطہ نہیں کیا گیا۔ نیٹشے ماحصل فلسفی کم ہے

اور شاعر زیادہ۔ اس کے اقبال میں ایک حرارت اور ایک والہانہ پن ہے جو محض فلسفے کی چیز نہیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات کو کہیں بھی ایک منظم صورت میں پیش نہیں کیا۔ اقبال نے اپنے چھ ٹکڑوں میں اپنے فلسفے کو جس باقاعدہ طور سے ترتیب دیا ہے، وہ نیٹشے کے ہاں نایاب ہے۔ اقبال نیٹشے سے Vbermensch یا فوق الانسان کے تخیل سے متاثر ہوئے ہیں۔ مگر صرف ایک حد تک نیٹشے کا Vbermensch محض قوت کا مظاہرہ ہے۔ اقبال کا نصب العین اس سے بلند ہے۔ وہ زور اور قوت کو مستقل اقدار کے تابع رکھتے ہیں۔ ان کا انسان کامل ایک دردمند دل پہلو میں رکھتا ہے اور اس کی زندگی ایسے اصولوں کی پابند ہے جو وقتی مصالح اور زمانے کی مقتضیات سے تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ اور چونکہ مستقل اقدار وہی ذات متعین کر سکتی ہے جو خود تغیرات وحوادث سے ماوراء ہو، اس لئے اقبال کا انسان خدا کا بندہ ہے اور اس کا مقام، مقام عبودیت ہے۔ نیٹشے خدا کا منکر ہے، اور اسی وجہ سے اس کے مافوق البشر کے سامنے اپنے اور اپنی بے راہ روی کے علاوہ کوئی نصب العین نہیں۔ اقبال نے نیٹشے کے متعلق کہا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

اقبال نے اپنے انسان کامل کا تصور اگر کہیں سے اخذ کیا ہے، تو وہ قرآن سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ماخذ کوئی ہے تو رومی ہے، یا ایک حد تک عبدالکریم الجیلی کی تصنیف الانسان الکامل۔ مگر نیٹشے کے اثرات بھی ان کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔ اسرارِ خودی میں حکایت الماس وزغال نیٹشے کے اقوال زردشت سے ماخوذ ہے۔ اور راہب دیرینہ افلاطون حکیم۔ از گروہ گوسفندانِ قدیم والا سارا حصہ بھی نیٹشے کے خیالات کا پرتو ہے۔ نیٹشے کا خیال تھا کہ دنیا کی غلام قومیں اپنے آقاؤں کو زیر کرنے کے لئے عام طور پر یہ حربہ استعمال کیا کرتی ہیں کہ اپنی غلامانہ تہذیب کے اقدار کو ان پر مسلط کریں، اور انہیں ان اقدار کی فوقیت سے مرعوب کریں۔ یہ بعینہ ایسا ہے کہ بھیڑیں شیر سے کہیں کہ گھاس کھانا تہذیب کی بلندی ہے اور گوشت کھانا تہذیب کی پستی۔ اور شیر بھیڑوں کی یہ بات مان لے۔ اقبال نے اسی خیال اسرارِ خودی میں نقل کیا ہے۔

اسرار کے آخری حصے میں جہاں اقبال نے اپنے مردِ کامل سے خطاب کر کے کہا ہے کہ:۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

تو اس خطاب میں بھی ایک نیٹشیانہ رنگ ہے۔ پیامِ مشرق میں پند باز با بچۂ خویش میں بھی یہی رنگ ہے۔ یا بالِ جبریل میں جہاں عقاب کی زبان سے فرماتے ہیں۔

جو کبوتر پہ جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

تو وہاں بھی یہی انداز جھلکتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات ہیں جہاں نیٹشے کے مطالعے کے اثرات نظر آتے ہیں۔

ایک اور یورپین مفکر جو ایک حد تک اقبال پر اثر انداز ہوا ہے برگساں ہے۔ جزئیات کو چھوڑ کر

کہا جاتا ہے کہ اقبال کے ہاں عقل اور عشق کے متقابل تصورات برگسان کے ... Reason اور Intuition کا عکس ہیں۔ میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے۔ اقبال کا عشق برگسان کی ..... Intuition کی نسبت رومی کے تصورِ عشق سے زیادہ قریب ہے۔ اور شاید رومی کا کلام ہی اس کی بنیاد بھی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اقبال نے برگسان کا مطالعہ گہرے طور سے کیا ہے اور اپنے چھ لکچروں میں برگسان کے مختلف خیالات کی تنقید کی ہے۔ انہیں برگسان کے فلسفۂ وقت میں خاص طور سے دلچسپی ہے اور وہ اس کا مقابلہ مختلف صوفیا کے خیالات و تجربات سے کرتے ہیں۔

گوئٹے اور اقبال کا تعلق بھی ایک مستقل مضمون ہے جس کا ابھی پورے طور سے مطالعہ نہیں کیا گیا۔ اقبال کا پیامِ مشرق، تمام تر گوئٹے کے دیوانِ مغرب کا جواب ہے۔ اس کتاب میں جو شاید فنی اعتبار سے اقبال کا شاہکار ہے، اقبال کا مغرب سے تعلق پورے طور سے واضح ہوتا ہے۔ بلکہ اقبال نے قریب قریب ہر اس مغربی مفکر اور شاعر کا الگ الگ ذکر کیا ہے، جس سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ گوئٹے کی ایک نظم "نغمۂ محمدؐ" کا ترجمہ پیامِ مشرق میں شامل ہے جو یقیناً فارسی زبان کی بہترین نعتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں اور بھی گوئٹے کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر "نوائے وقت" کی نظم میں اقبال وقت کی زبان سے فرماتے ہیں:۔

من کسوتِ انسانم ... پیراہنِ یزدانم

اس کے مقابلے میں گوئٹے کے "فاوسٹ" میں اس شعر کو دیکھئے۔

Thus at times humming loom my hand prepares.

The Garment of life that the Deity wears.

یہ بیرڈ ٹیلر کا ترجمہ ہے۔

گوئٹے کے کلام میں خودگری اور خودنگری کا تخیل موجود ہے۔

Be Self possessed

That is the only art of life

یہی تخیل اقبال میں بھی جھلکتا ہے۔ اگرچہ اس کا ماخذ گوئٹے کے کلام کو نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حال اقبال کے تصورِ شیطان کا ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے جو صفات مثلاً عقل، اپنے شیطان کے لئے منتخب کی ہیں، وہ گوئٹے کے "فاوسٹ" کے شیطان یعنی Mephistopheles کی صفات سے مشابہ ہیں۔ لیکن وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اقبال کے تخیل کی بنیاد گوئٹے پر ہے۔ کیونکہ صوفیانہ افکار میں اس قسم کے خیالات عام ہیں جن میں عقل کو شیطان سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور یہ افکار اقبال کے لئے گوئٹے کی تصنیف کی بہ نسبت زیادہ قریب تھے۔

(بقیہ صفحہ پر دیکھئے)

۲۱ر اپریل ۱۹۳۸ء

بیسویں صدی کا آغاز ہے۔ مشرق کی تہذیب و تمدن کے ٹمٹمانے والے آخری چراغ بھی گل ہو چکے ہیں۔ مغرب نے ایک نئے نظام تمدن کی طرح ڈالی ہے جس کی درخشندگی اور تابناکی نے بڑے بڑے دیدہ وروں کی نگاہوں میں خیرگی پیدا کر رکھی ہے۔ دنیا بھر کی قومیں اس تہذیب جدید کی نقالی میں فخر و سعادت محسوس کر رہی ہیں۔ جلیل القدر دانایان روزگار اس نئے تمدن کو انسانیت کے مصائب و نوائب کے لئے مسیحا سمجھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے مفکر انسانی دانش و بینش کے اس اوج کمال پر نازاں و فرحاں دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف سے اس نئی روشنی کی مدح و ستائش میں قصائد لکھے جا رہے ہیں۔ چاروں سمت سے تحسین و تبریک کے غلغلے بلند ہو رہے ہیں۔ چھوٹے بڑے اس نسخہ کیمیا کی برکات کے معترف ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے گویا انسان نے اس فردوس گم گشتہ کو پھر سے پا لیا جس کی تلاش میں اسے ساری عمر دشت پیمائیوں اور صحرانوردیوں میں گذارنی پڑی تھی۔ نئے انداز کی سیاست۔ نئی وضع کی معاشرت۔ معیشت کے اطوار طریق نرالے، تعلیم کے ڈھب انوکھے۔ تمام نظامہائے کہنہ کی بنیادیں تک اکھیڑی جا چکی ہیں۔ اور نئے نقشوں کے مطابق بالکل جدید بنیادوں پر اس تہذیب نو کے قصر فلک بوس کی عمارت اوپر کو اٹھتی چلی جا رہی ہے۔ جس کی رفعت و بلندی، نقش و نگار آئینہ بندی، حریر و اطلس کے نگاہ فریب پردے، بجلی کے قمقمے اور ان قمقموں کی عالمتاب روشنی میں ایک رنگین دنیا، ہر دیکھنے والے کی نگاہ کو حیرت کدہ بنا رہی ہے کہ اتنے میں مشرق کے تیرہ و تار ویرانوں کا ایک تیس سالہ نوجوان اس طلسم خانہ بھولا میں آ نکلتا ہے۔ وہ تہذیب نو کے اس خیابان رنگ و بو میں کھویا کھویا ادھر ادھر پھرتا ہے۔ ہر شے پر ایک غائرانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ ہر چیز کو تجسس ساز نظروں سے پرکھتا ہے۔ کہیں رکتا ہے تو پہروں کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا خاک کے ذروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا ہے۔ پھر اٹھتا ہے تو دیوانوں کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے۔ ہونہار ایسا ہے کہ بڑے بڑے مفکرین اسے مستقبل کا درخشندہ ستارہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے اس کمال ہوش میں کچھ ایسے غیر محسوس سے "جنون" کی آمیزش ہے جو اسے دوسرے ہوش مندوں سے یکسر الگ کئے ہوئے ہے۔ وہ فکر و نظر

اور ہوش و جنون کے اس مرکب امتزاج سے تہذیب جدید کے اس طلسم کدہ کے ایک ایک عنصر کو دیکھتا ہے اور عین اس وقت جبکہ ساری فضا اس نظام تمدن کی توصیف و ستائش میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس کے لبوں پر خفیف سی ہنسی اور اس کی آنکھوں میں پہلے سے تبسم کی روح کے جلوے نظر آتے ہیں۔ وہ اس پورے تماشے کو اپنی نگاہ کے دامن میں سمیٹ کر رکھتا ہے اور لب ساحل ایک اونچی سی چٹان پر کھڑا ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھتا اور بلند آواز سے پکار اٹھا کہ

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو۔ وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

اور یا در کھو کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

سننے والوں نے سنا اور اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر ایک فلک بوس قہقہہ لگایا اور اس کے بعد پھر اسی کیف و مستی کی دنیا میں جذب ہو گئے۔ یہاں پہنچنے پر پوچھنے والوں نے پوچھا کہ کہو بھائی! عبرت خانۂ مغرب کی سیر تو کی وہاں تہذیبِ نو کے پری محل کو بھی دیکھا! کیا خیال ہے؟ اس نے اپنے مخصوص انداز میں نگاہوں کو اٹھایا اور کہا کہ — ہاں دیکھا! چمک دمک تو بڑی ہے۔ لیکن

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سست بنیاد بھی ہے۔ آئینہ دیوار بھی ہے

زمانہ آگے بڑھتا گیا۔ شیشہ گرانِ فرنگ اپنے کاخِ تہذیب کی آئینہ بندی میں پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور انہماک سے مصروف رہے۔ دنیا اسے بدستور خدا کی رحمت تصور کرتی رہی۔ انسانیت اسی طرح اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی تا آنکہ ۱۹۱۴ء میں ایک عالمگیر دھماکہ محسوس ہوا۔ دھماکہ زلزلہ کی صورت اختیار کر گیا اور چار برس تک متواتر بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوتی رہیں۔ میدانوں کا ذرہ ذرہ انسانی خون کی ارزانی کی زندہ داستان بن گیا۔ لیکن مغرب نے اس کے بعد پھر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اور اس قصرِ جدید کی تزئین و آرائش اور حفاظت و رعایات میں پہلے سے بھی زیادہ جوش اور سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ سطح بیں نگاہوں نے اس "مجذوبِ دیوانہ" سے پھر پوچھا کہ اب کیا کہتے ہیں آپ؟ آپ کی وہ پیش گوئی تو غلط ثابت ہوئی۔ اس مردِ دانا کی آنکھوں میں پھر تبسم کی لہر دوڑی اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہو کر۔ اپنے مخصوص انداز میں سر اٹھایا اور کہا کہ میری آنکھوں نے غلطی نہیں کی۔ میں نے جو کچھ کہا تھا حرف بحرف دیکھ کر کہا تھا۔ وہ غلط نہیں ہو سکتا۔ مغرب کو یہ فطرت کی طرف سے پہلی تنبیہ تھی وہ اس سے عبرت حاصل کرتے تو بچ جاتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور میری آنکھیں پھر دیکھ رہی ہیں کہ

فتنہ را کہ دو صد فتنہ در آغوشش بود
دخترے ہست کہ در مہدِ فرنگ است ہنوز

سننے والوں نے اسے سنا اور ان سنی کر دی۔ مغرب کے قمقموں کی روشنی اپنی خیرگی میں اور بھی بڑھ گئی۔ اب ساری دنیا اس کی نقال تھی۔ اور اس نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ پوچھنے والوں نے پھر اس "مجذوبِ زیرک" سے پوچھا کہ فرمائیے! آپ کیا کہتے ہیں؟ اب تو اس قصرِ بلند کی رفعت کہکشاں تک جا پہنچی ہے۔ اس نے پھر ایک سیلِ تبسم سے پوچھنے والوں کی طرف دیکھا اور کہا کہ

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے　　کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
الٹ جائیں گی تدبیریں۔ بدل جائیں گی تقدیریں　　حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی!

دنیا نے اس پر ایک قہقہہ لگایا۔ اور مغرب اپنی شیشہ گری اور مشرق اس کی نقالی میں پھر مصروف ہو گیا۔ اور وہ مردِ زیرک پھر اپنی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ مغرب نے زمین پر جال بچھا لیا۔ مغرب نے آسمان پر قابو پا لیا۔ اس نے باقی پر اپنا تسلط جما لیا۔ اس نے خشکی اور تری کو مسخر کر لیا۔ اس نے اپنی حفاظت کے پورے سامان مہیا کر لئے۔ ادھر یہ ہوتا گیا اور ادھر دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس دانائے راز پر کچھ عجیب سراسیمگی کا عالم طاری ہو رہا ہے۔ وہ بیٹھا بیٹھا اس طرح چونک اٹھتا جیسے ایک حسین و معصوم بچہ خواب میں دہشتناک عفریت خونخوار کو دیکھ کر چیخ اٹھتا ہے۔ وہ تصوری تصویریں کچھ دیکھتا اور یوں ڈر کر سہم جاتا جیسے جنگ اور خون کا کوئی سیلاب بلا بڑھتا چلا آ رہا ہو۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر دور افق سے اس پار کچھ دیکھتا اور بے ساختہ چلا اٹھتا کہ

شفق نہیں مغربی افق پر۔ یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے
طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ!
وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ!
وہ دیکھو!　　جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا۔ وہ عالمِ پیر مر رہا ہے!
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ!

وہ راتوں کی تنہائیوں میں اکیلا دیوانہ وار ادھر ادھر پھرتا۔ کبھی آسمان کے خاموش ستاروں سے باتیں کرتا۔ کبھی ندی کی ساکت روانیوں سے محوِ تکلم ہوتا۔ وہ جنگل کے ویرانوں سے دور، شہر کی اس محفلِ شور و شراب کی چکاچوند کو دیکھتا جسے بڑے بڑے ہوشمندوں نے باعثِ گرمیٔ کائنات سمجھ رکھا تھا۔ تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتا اور اپنے سینے کے داغوں کو نمایاں کر کے پکار اٹھتا کہ

وہ بزمِ عیش ہے مہمانِ یک نفس دو نفس　　چمک رہے ہیں مثالِ ستارہ جس کے ایاغ
اور　دلوں میں ولولۂ انقلاب ہے پیدا　　قریب آ گئی شاید جہانِ پیر کی موت

وہ کبھی کسی نخلستان کے قریب۔ کھجوروں کے جھنڈ کے سایہ میں وجد و مستی میں رقص کرتا اور مطربِ فطرت کی نے نوازی کی ہم آہنگی میں والہانہ انداز میں گاتا نظر آتا کہ

زمانہ کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ　　کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

ایک حجازی قافلہ پاس سے گزر رہا تھا۔ سالار کارواں نے اس تماشے کو حیرت سے دیکھا اور کہا کہ بابا! یہ کیا کہتے ہو۔ آؤ! تمہیں دکھائیں کہ اس تہذیب نو نے ہمارے عروق مردہ میں کس طرح ایک تازہ خونِ زندگی دوڑا دیا ہے۔ اس نے
اس سادہ لوح نے سالار کارواں کی بات سنی اور ہنس کر کہا کہ ارے نادان!

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

اس نے پوچھا کہ پھر ہوگا کیا؟ بتایا کہ

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت
آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

اس نے پوچھا کہ اس کے لئے پھر کرنا کیا چاہیئے؟ جواب ملا کہ

اگر ز عقل جہانِ تازہ داری برون آور
کہ فرنگ از جراحت ہائے پنہاں بسمل افتادہ است

اس نے پوچھا کہ کیا دنیائے مسیحیت پھر کسی صلیبی جنگ کے ارادے کر رہی ہے۔ لیکن اس مرد دانا نے کہا کہ نہیں۔

من از ہلال و چلیپا دگر نیندیشم
کہ فتنۂ دگرے در ضمیر ایام است

اس نے کہا کہ مغرب کے آہنی پنجے تو دیں، آسمان کو اپنی قاہری گرفت میں لئے بیٹھے ہیں۔ اس چنگل سے رستگاری بھلا کیسے ممکن ہے! مرد قلندر ہنسا اور اس نے کہا کہ اس گرفت کی شدت بجا اور درست۔ لیکن

پانی بھی مسخر ہے ہوا بھی ہے مسخر — کیا ہو جو نگاہِ فلکِ پیر بدل جائے
دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب — ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے

لیکن یہ باتیں اس پوچھنے والے کی سمجھ سے باہر تھیں۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مغرب جو اس قدر بے پناہ قوتوں کا مالک ہے کبھی تباہ و برباد ہو سکتا ہے۔ وہ شوکت و سطوت، غلبہ و تسلط، استیلاء و قہرمانی کے اس بحر مواج کو دیکھتا اور کانپ اٹھتا۔ وہ بھلا کیسے باور کر لیتا کہ کہنے والا سچ کہتا ہے۔ لیکن کہنے والا کچھ ایسے عزم و یقین سے کہہ رہا تھا گویا اس کے سامنے سینما کا ایک فلم چل رہا ہے جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بتاتا جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ اس نے
اس پوچھنے والے سے کہا کہ تیری حیرت اور استعجاب درست! لیکن جو میں کہتا ہوں وہ بھی غلط نہیں!

تو نے دیکھا سطوتِ رفتارِ دریا کا عروج — موجِ مضطر کس طرح بنتی ہے اب زنجیر دیکھ
آزمودہ فتنہ ہے اک اور بھی گردوں کے پاس — سامنے تقدیر کے رسوائیِ تدبیر دیکھ
کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں — آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

سننے والے نے سننے کو تو سنا کہ ان باتوں میں لذت و جاذبیت بہت تھی۔ لیکن اسے محض "شاعری" ہی سمجھا اور

دادِ سخن دے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے جاتے جاتے بھی اس مردِ قلندر نے اسے آواز دی اور کہا کہ میری باتوں کو شاعری نہ سمجھو یہ حقیقت ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است
زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

لیکن سننے والے نے اسے بھی شاعری ہی سمجھا اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس مردِ دانا نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

مغرب ز تو بیگانہ، مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقشِ دگر انگیزی

*

دنیا اپنی روش پر بدستور چلی جا رہی تھی۔ تہذیبِ مغرب اپنے پورے شباب پر تھی۔ نظامِ افرنگ کی رعنائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ فقیرِ کج کلاہ برابر اپنی پکار کو دہرائے جا رہا تھا کہ

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

کسی کی سمجھ میں یہ حقیقت نہیں آتا تھا کہ اس دیدہ ور کو کیا نظر آ رہا ہے جس کی بنا پر یہ اس شدت و اصرار سے اپنی بات کو دہرائے جا رہا ہے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے یہ مغنی آتش نفس خلوت و جلوت بستی اور ویرانہ میں ہر جگہ اپنے پیغام کو پہنچائے جا رہا تھا۔

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم — غزل سرائیم و پیغامِ آشنا گوئیم
تجلّیے کہ سخن می شود حجابِ آنجا — حدیثِ دل بزبانِ نگاہ می گوئیم

جب پوچھنے والے زیادہ اصرار کرتے تو وہ ایک ہلکے سے معنی خیز تبسم سے اتنا کہہ دیتا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس سے ان کی حیرت اور بھی بڑھ جاتی اور دوبارہ کاوش سے بات کرنے کی کوشش کرتے تو یہ خمکدۂ حجاز کا متوالا یارانِ میکدہ سے کہہ دیتا کہ

بگزراں جبلم واز ہنگامۂ افرنگ کم تر گو
ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ بے پیچے

متجسّس قلوب سے تو وہ اس شانِ دل ربائی سے باتیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی ضد اور کد سے ان حقائق کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس سے ذرا کھلے کھلے الفاظ میں گفتگو کرتا اور برملا کہہ دیتا کہ

گفت اے گندم نمائے جو فروش — از تو شیخ و برہمن اندر خروش

حکمتے کو عقدۂ اشیا رکشاد با تو غیر از فکر چنگیزی نداد
مرگ تو اہل جہاں را زندگی ست باش تا بینی کہ انجامِ تو چیست

وہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتا۔ لیکن اس کی باتوں میں کچھ ایسی حلاوت تھی کہ ہر ایک کا جی چاہتا کہ اس سے ذرا اور قریب ہو کر اس کی باتیں سنی جائیں۔ لوگ قریب بڑھتے تو وہ ذرا اور دور ہو جاتا کہ اپنا محرمِ راز کسی کو نہ پاتا۔ وہ اپنی باتیں اپنے دل سے زیادہ اطمینان سے کرتا۔ لیکن غیرت سے کرتا یا اپنے آپ سے۔ آنے والے انقلاب کے تصور سے اس کا دل طلسمِ پیچ و تاب بنا رہتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور دعائیں مانگتا کہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں!!

وہ زمانہ کی بے کیف گردشِ دولابی سے گھبرا اٹھتا اور خالقِ فطرت سے اپنے عجیب محبوبانہ انداز میں کہتا کہ

طرحِ نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نَے نواز کی نواؤں میں تلخی اور سینے میں سوز بھی زیادہ ہوتا گیا وہ اب حقائق کو زیادہ نکھرے ہوئے الفاظ میں بیان کرنے لگ گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو چیزیں اس کے عالمِ تصور میں دھندلے سے خواب کی صورت میں متشکل تھیں اب محسوس پیکر اختیار کر رہی ہیں اب وہ کھلے کھلے الفاظ میں کہتا کہ

یہ عناصر کا پرانا کھیل یہ دنیائے دوں ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خون
اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ۔ ارمغانِ حجاز آخری تصنیف)

ابلیس کے ایک دوسرے مشیر کی زبان سے کہلوایا گیا ہے۔

زاغِ دشتی ہو رہا ہے ہمسرِ شاہین و چرغ کتنی سرعت سے بدلتا ہے مزاجِ روزگار
چھا گئی آشفتہ ہو کر وسعتِ افلاک پر جس کو نادانی سے ہم سمجھے تھے اک مشتِ غبار
فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار
میرے آقا وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

غرضیکہ وہ صاحبِ خرد و جنون اس تہذیب کے مآل سے دنیا بھر کو آگاہ کئے جاتا رہا۔ لیکن دنیا کی یہی حالت رہی کہ اس کی باتوں کو سنا اور پھر اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے۔ زمانہ یوں ہی گزرتا گیا کہ ایک دن بستی والوں نے دیکھا کہ یہ مردِ درویش کچھ اس انداز سے مضطرب و بیتاب ہے جس طرح بعض پرندے طوفان آنے سے پیشتر اضطراب و سراسیمگی میں ادھر ادھر اڑتے اور چکر لگاتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ بابا! خیر ہے؟ آج یہ بے کلی اور بے چینی کیوں ہے۔ کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں! اگر عافیت چاہتے ہو تو اب بھی اپنے آپ اور اپنی نسلوں کو خدائے قوی و مقتدر کی

حفاظت میں لے آؤ۔ ورنہ یاد رکھو کہ طوفان بلا انگیز میں خس و خاشاک کی طرح بہ جاؤ گے۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

بستی والوں نے سنا اور حسبِ دستور ایک خفیف سی ہنسی سے اس کا استقبال کیا۔ رات کو سو لا محفلِ رقص و سرود میں محو کیف و سرور رہے۔ آخری شب آنکھ لگی۔ تو محسوس ہوا گویا زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہیں۔ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے۔ دہشت میں ادھر اُدھر بھاگے۔ دیکھا تو اس قصرِ رشید کی بنیادیں تک ہل رہی ہیں۔ جس کے متعلق کبھی تصور میں بھی نہ آتا تھا کہ یہ تزلزل ہو سکے گا۔ آندھی اور جھکڑ کا طوفان۔ زلزلے کے جھٹکے۔ یہ مکان گرا۔ وہ دیوار ٹوٹی۔ باہر تند و تیز بارش اندر تباہی و بربادی۔ سامنے ڈونگر کی پہاڑیوں کو دیکھا تو آتش فشاں چوٹیوں سے لاوے کا سیلاب امنڈا چلا آ رہا ہے اور جو کچھ سامنے آتا ہے لے کے اپنے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں لے بربادیوں کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ بستی والوں کو اپنے پرائے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ اب اُن کی سمجھ میں آیا کہ وہ مردِ دانا کیا کہتا تھا: اس سراسیمگی میں اُٹھے اور اس فقیر کی کٹیا کی طرف لپکے کہ اُسی دانائے راز سے پوچھیں کہ اس سیلابِ فنا سے بچنے کی بھی کوئی صورت ہے۔ بھاگے بھاگے کٹیا پر پہنچے۔ لیکن دیکھا تو کٹیا خالی ہے۔ وہ مردِ درویش کہیں چلا گیا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کوئی تدبیر سجھائی نہیں دیتی تھی۔ کٹیا کے اندر عین وسط میں نورِ قرآنی کی قندیل جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ ایک طرف ایک کدوئے کہنہ میں عشقِ محمدی کی شراب کچھ چھلک رہی تھی۔ اور سامنے دیوار پر جبریل کے پروں سے لکھا تھا کہ

سرودِ رفتہ باز آید نیاید　　　نسیمے از حجاز آید نیاید!
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے　　　دگر دانائے راز آید نیاید

بستی والوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو ایک طرف ایک کشکول دکھائی دی جس کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

بحضورِ ملت

دیکھا تو اس میں کاغذات کے کچھ ٹکڑے نہایت ترتیب سے رکھے ہیں۔ سب سے اوپر ۱۹۱۲ء کا ایک ٹکڑا ہے یہ وہ وقت تھا جبکہ ملتِ بیضا کا انحطاط اپنی انتہائی پستی تک پہنچ چکا تھا۔ اور کہیں کسی طرف امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔ عین اس مایوسی اور بے کسی کے ماحول میں اس امیدوں کے شاہزادے نے گرتی ہوئی قوم کا بازو تھاما اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیوں گھبرائے ہو۔ کیوں خوف کھاتے ہو۔

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا　　　سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
سفینۂ برگِ گل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہوگا

لوگوں نے سنا اور معنی خیز تبسم سے اس کا استقبال کیا کہ یہ انحطاط اور اس پر یہ "موہوم" امیدیں! اس کے نیچے سن ۱۹۱۲ء کا ایک پرزہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ بلقان میں ملت اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیر بھی نشانہ خطا کر کے ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ سطوت اسلامیہ کے ابھرنے کی بظاہر کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ مایوسیوں کی تاریکی نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اس ظلمت و تاریکی میں وہ شمع بدوش کاروان حجاز اٹھا اور اپنی مخصوص لے میں پکار کر کہا کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ادھر — جلوہ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھو — دیکھو اور اپنی آنکھوں سے دیکھو کس طرح

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں باد بہار — نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک — بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹکڑے پر یہ لکھ رکھا تھا۔

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے
(جواب شکوہ)

ادھر یورپ کے میدانوں میں خون مسلم کی یوں ارزانی ہو رہی تھی اور ادھر ہندوستان میں ان ہی دنوں ایک ایسی تحریک کی ابتدا ہوئی جو آتش خاموش کی طرح وحدت ملت اور عالمگیریت اسلام کو اندر ہی اندر جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دینے والی تھی۔ اس مرد دانا کی نگہ دور رس اگر ایک طرف فلسفۂ مغرب کے آتشیں منظر پر خوننابہ فشاں تھی تو دوسری طرف اس تحریک جدید کی ہلاکت سامانیوں سے بھی غافل نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ تھا کہ قومیت پرستی (یعنی وطن کو وجہ جامعیت قرار دے کر متحدہ قومیت کی تشکیل) میں بھی مسلمانوں کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ ہے۔ بڑے بڑے مدبران ملت اپنی وطن پرستی پر فخر کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن ان سب میں اکیلا یہ مرد دانا تھا جس نے بلند آہنگی سے پکار کر کہا کہ

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور — ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ تہذیب مغرب کی تقلید میں نیشنلزم گویا وقت کا فیشن بن رہی تھی۔ مہذب ہونے کا ثبوت یہ تھا

کہ انسان نیشنلسٹ ہوچکا ہے اس زمانہ میں اس دیدہ ور کی نگاہوں نے دیکھ لیا کہ یہ نیا فتنہ کس قدر اسلام کے بنیادی خطوط سے متضاد و متباین ہے۔ اس نے قوم کو جھنجوڑ کر کہا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

اس لئے کہ:-

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس کے بعد ایک اور ورق ملا۔ یہ اس زمانہ کا لکھا ہوا تھا جب ہندوستان میں جدید اصلاحات کا دور دورہ تھا جن کی رو سے یہاں مغربی انداز کے جمہوری نظام کی طرح ڈالی گئی تھی۔ وقت وہ تھا کہ مغربی جمہوریت کو نوعِ انسان کی تمام مصیبتوں کا حل بتایا جاتا تھا۔ اسی میں اصل آزادی کا راز مضمر سمجھا جاتا تھا۔ تمام ہندوستان نے جمہوری نظام کی طرف ان اصلاحی اقدام کا خیر مقدم کیا حتیٰ کہ مسلمانوں کی طرف سے تو بشدّ آہنگی سے نعرے لگنے شروع ہو گئے کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور کسی نے یہ نہ سمجھا کہ اس جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کس قدر بعد المشرقین ہے۔ یہ جمہوریت وہ تھی جس کی رو سے قانون سازی کا اختیار انسانوں کی ایک جماعت کے سپرد کیا جاتا تھا اور یوں اقلیت پر اکثریت کے فیصلوں کی پابندی لازم تھی۔ ادھر ساری دنیا اور ہندوستان کے مسلمان، ان جمہوری اصلاحات پر چراغاں کر رہے تھے اور ادھر یہ مرد دانا انہیں متنبہ کر رہا تھا کہ یاد رکھو۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اس ورق کے دوسری طرف لکھا تھا۔

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

ان ہی دنوں کا لکھا ہوا ایک اور ورق ملا۔ زمانہ وہ تھا جب یورپ کے گدھ ترکی کے مردِ بیمار کی لاش پر منڈلا رہے تھے۔ عرب و عجم میں مسلمانوں کی رہی سہی قوتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔ جنگِ عظیم کے بعد کے اثرات سے ملت اسلامیہ کا جسمِ ناتواں نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ زمانہ جس میں

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل — خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

ہوگیا مانندِ آبِ ارزاں مسلماں کا لہو — مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

اس عالمگیر مایوسی میں جبکہ کہیں سے شعاعِ امید جلوہ افروز نظر نہیں آتی تھی۔ اس مردِ مومن نے اپنی قرآنی فراست سے دیکھا کہ مایوسیوں کے ان خوفناک بادلوں کے پیچھے امید کی سنہری کرن بھی موجود ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈوبتی ہوئی قوم کو حوصلہ دلایا کہ وجہِ اضطراب کچھ نہیں۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

اس کے نیچے لکھا تھا:-

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

ادھر اس قدر تابناک امیدوں کی قندیل کو روشن کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یورپ کی ہمسائیگی میں بسنے والے ترکوں کو اس سے بھی آگاہ کر دیا۔ کہ یاد رکھو کہیں تم بھی تہذیبِ مغرب کے فریب میں نہ آجانا۔

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی — یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو — ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے

تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے

پھر ایک اور یادداشت ملی یہ اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جب روس کا بالشویکی نظام عالمگیر حیثیت اختیار کئے

جا رہا تھا۔ اور چونکہ یہ نظام سرمایہ داری کا ردِ عمل تھا اور گھبرایا ہوا انسان یہ سمجھ رہا تھا کہ بس وہ تریاق ہاتھ آگیا جو زمانۂ حاضرہ کے ہر قسم کے زہر کا مداوا ہے۔ اپنے مرکز سے ہٹا ہوا مسلمان بھی یہی کہہ رہا تھا کہ ہاں! یہ نظام عین اسلامی نظام ہے۔ اس عالمگیر غلغلہ اندازی میں اس مردِ دانا نے اس نظامِ اشتراکیت کا تجزیہ کیا اور فریب خوردہ مسلمان کو بتایا کہ یہی سراب ہی سراب ہے۔ تو ابھی صرف تخریب (لا) سے بلند نہیں ہوا اگر تمہیں اس کے ساتھ تعمیر (الّا) کی بھی ضرورت لاینفک ہوتی ہو؟ نظامِ اشتراکیت پر غور کرو۔

لشکر او در تند باد لا بماند مرکب خود را سوئے الّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا ساز و برگِ امتاں نفی بے اثبات مرگِ امتاں

پھر ایک اور یادداشت ملی۔ یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب یورپ نے بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ کے لئے مجلسِ اقوام کی طرح ڈالی تھی اور دنیا خوش تھی کہ اب نزاع اور جھگڑوں کا زمانہ ختم ہو گیا۔ جنگ نابود ہو گئی۔ اب کمزوروں پر ظلم و استبداد روا نہیں رکھا جائے گا۔ ہر ایک کی داد رسی ہوگی۔ دنیا خوش اور مطمئن تھی۔ لیکن اس مردِ دانا نے سر ہلا دیا اور کہا کہ

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

اس کے نیچے لکھا تھا کہ

نقشِ نو اندر جہاں باید نہاد از کفن دزداں چہ امید کشاد
در جنیوا چیست غیر از مکر و فن صید تو ایں میش و آں نخچیر من
نکتہ ہا کو می نگنجد در سخن یک جہاں آشوب و یک گیتی فتن

ادھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر ہندوستان میں وطن پرستی۔ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں، وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا تھا اور بھولا بھالا مسلمان بلا سوچے سمجھے اپنے ہاتھوں سے اس دام کے حلقے کستا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ دانائے راز برابر پکارتا چلا جا رہا تھا کہ یاد رکھو یہ سرابِ رنگ و بو ہے۔ یہ تمہاری غلامی کی نئی زنجیریں ہیں۔ وطنیت کی بنا پر قومیت کا تصور تمہیں دورِ اسلام سے نکال کر عہدِ جاہلیت کی طرف لے جائے گا۔ ایک کاغذ کے پرزے پر اس مجری تار کی نقل تھی جو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے نمائندوں کے نام بھیجی گئی تھی کہ دیکھنا کہیں مخلوط انتخاب کو تسلیم نہ کر لینا۔ یہ تمہاری جمعیتِ اسلامی کی بنیادیں اکھیڑ کر رکھ دے گا۔ ایک یادداشت کا تھوڑا سا ٹکڑا موجود تھا جس میں نہرو رپورٹ کی مخالفت کی تلقین تھی۔ ۱۹۲۸ء کی لکھی ہوئی

ایک لمبی چوڑی دستاویز ایک خریطہ کے اندر سنبھال کر رکھی ہوئی ملی۔ اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں۔ ایک مقام پر جلی حروف میں لکھا تھا۔

میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب۔ صوبہ سرحد۔ سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری زیر سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر کچھ بھی ہو۔ مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے:

بستی کے لوگ کشکول کی ان دستاویزوں کو کھول رہے تھے اور فقیر کی ہیبت ان کے دلوں پر چھائے جا رہی تھی وہ محسوس کرتے تھے کہ گویا وہ ابھی تک کشکول کے اندر ہی ہے۔ ان دستاویزوں کا انداز کچھ ایسا لاہوتی سا تھا کہ وہ اس زمین کی باتیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔

پھر کچھ اور متفرق یادداشتیں ملیں۔ کسی میں افسردہ دل صوفی سے کہا گیا تھا کہ

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہیں ظاہر پرست ملا سے تخاطب تھا کہ

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

کہیں اس زمانہ کے جھوٹے مدعیان امامت و نبوت سے خطاب تھا کہ

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

کہیں افرنگ زدہ مسلمان سے کہا گیا تھا کہ

ترا وجود سراپا تجلیِ افرنگ — کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی — فقط نیام ہے تو زرنگار و بے شمشیر

کہیں اربابِ فنونِ لطیفہ کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو! — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

کہیں فلسفہ دانوں کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ

سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری — ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

بستی والے ان یادداشتوں کو دیکھتے تھے اور حیران ہوئے جاتے تھے۔ کہ یہ مردِ قلندر کس مقامِ بلند پر تھا کہ اس کے سامنے ہر شے اپنی اصلی شکل میں بے نقاب ہو جاتی تھی اور وہ ان تمام چیزوں کے محاسن و معائب کو کس طرح کھلے ہوئے الفاظ میں بیان کر دیتا تھا۔ پھر یہ بھی کہ اس چھوٹی سی کٹیا کے اندر رہتے ہوئے اس کی نگاہ کس طرح

یک چمن گل۔ یک نیستاں نالہ۔ یک خمخانہ مے

اپنے دامن میں رکھتی تھی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اور علم و سائنس کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جس کو یہ محیط نہ ہو۔ ایک پرزہ دیکھا تو اس پر گویا آتشیں حروف میں چند شعر لکھے ہوئے ملے۔

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ ۔۔۔ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است ۔۔۔ چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست ۔۔۔ اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

پڑھنے والوں میں سے ایک نے کہا کہ جن صاحب کا نام لیا گیا ہے یہ تو سنا ہے کہ کسی دینی مکتب کے صدر مدرس تھے۔ ایک گوشے میں ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو واقعی صدر مدرس تھے لیکن اس فقیر دانا کو تم کیا سمجھتے ہو! اس کی شکل و صورت اور وضع قطع پر نہ جاؤ۔ اس کے گُن کا عالم ہم نے تو اپنی زندگی میں دیکھا نہیں۔ بستی والے یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہے تھے اور بیٹھے سر پیٹ رہے تھے کہ ہم نے اس دانائے راز کی کچھ قدر نہ کی یہ تو بیٹھے ہی بیٹھے دنیا کو کچھ سے کچھ کر گیا ہے۔ بستی والوں نے اس مرد بزرگ سے پوچھا کہ سائیں بابا! یہ تو بتاؤ کہ یہ مردِ دانا اس قسم کی باتیں کہتا کس طرح سے تھا۔ یہ تو ہمیں کسی اور ہی دنیا کا انسان نظر آتا ہے اس نے کہا کہ لوگوں کی یہی تو بھول ہے۔ یہ مردِ دانا اسی دنیا کا انسان تھا۔ اس نے نہ (معاذ اللہ) نبی ہونے کا دعویٰ کیا نہ مہدی کا نہ وہ مجددیت کا مدعی ہوا نہ امامت کا۔ اس نے اپنے آپ کو سیدھا سادا مسلمان کہا اور بس۔ بستی والوں نے پوچھا کہ ہماری بات تو وہیں کی وہیں رہی کہ جب اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تو پھر وہ ایسی باتیں کس طرح کہتا تھا۔ مرد بزرگ نے کہا کہ میں نے خود اس سے یہ سوال کیا تھا جس کے جواب میں مردِ دانا نے اپنے مخصوص تبسم سے کہا کہ اس میں "کرامات" کی کوئی بات نہیں۔ اپنی آنکھیں جن پر کسی بیرونی اثر کا رنگین چشمہ نہ ہو اور قرآن کریم کی روشنی اس سے وہ فراست پیدا ہو جاتی ہے جس سے ہر شے کی حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم ۔۔۔ ز افلاطون و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزۂ چشم ۔۔۔ جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

"میری صہبائے بصیرت" (مردِ دانا نے کہا) "میکدۂ حجاز سے سربمہر آبگینوں میں آتی ہے جس میں خالص قرآن ہوتا ہے"۔ یہ کہا اور مردِ دانا کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ فرمایا کہ کیا آپ نے میری وہ دعا نہیں سنی

جو آوِ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی کے تحائف کے ساتھ میں نے بحضور خواجہؐ کونین پیش کی ہے۔ سنئے کہ میں نے کیا اور بہت خوب پیشکش کی ہے

گر دلم آئینۂ بے جوہر است ۔۔۔ ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن ۔۔۔ ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا ۔۔۔ بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

آخری مصرع پڑھا اور پڑھتے ہی وہ مرد دانا بچوں کی طرح ہچکیاں لے کر رونے لگ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ سینۂ پاک تک قلب ہی قلب ہے جو سوز و گداز و تپش و خلش کا نازک آبگینہ ہے۔

بستی والے اس مرد بزرگ کی باتیں سن رہے تھے۔ ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو اور دل میں تلاطم اضطراب موجزن تھا۔ انہوں نے دیکھا تو ایک پرزے پر لکھا تھا۔

پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے

بستی والوں نے اس شعر کو دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگ گئے جب ذرا سنبھلے تو کہا کہ اے کاش! ہمیں یہی بتا دیا ہوتا کہ بالآخر ہم کریں کیا؟ دیکھا تو ایک ورق پر لکھا تھا

اے اسیرِ رنگ پاک از رنگ شو ۔۔۔ مومنِ خود کافرِ افرنگ شو

رشتۂ سود و زیاں در دستِ تست ۔۔۔ آبروئے خاوراں در دستِ تست

ایں کہن اقوام را شیرازہ بند ۔۔۔ رایتِ صدق و صفا را کن بلند

اہلِ حق را زندگی از قوت است ۔۔۔ قوتِ ہر ملت از جمعیت است

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

بستی والے افسردہ و غمگین کٹیا سے باہر آ گئے ہر ایک کی آنکھیں متلاشی اور قلب متمنی تھا کہ اے کاش! وہ مرد دانا کہیں سے پھرتا پھراتا ایک مرتبہ پھر ادھر آ نکلے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آہستہ آہستہ جا رہے تھے کہ انہوں نے سنا کہ دور پہاڑی کے دامن میں بیٹھے بیٹھے سرود میں کوئی گائے جا رہا ہے کہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جدید مملکت پر اقبال کی تنقید

از جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

اقبال پہلے کاروانِ ملتِ اسلامیہ کے منتشر افراد کو فکری طور پر ایک مرکز پر لایا۔ اس کے بعد اس نے ایک راہ گم کردہ قافلہ کو نشانِ منزل دیا، جبکہ سنہ ۱۹۳۰ء میں واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا کہ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کے لئے ایک ہی نصب العین ہے اور وہ یہ کہ جن علاقوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی جداگانہ اپنی اکثریت قائم ہو۔ اس نے قوم کو پاکستان کا تصور عطا کیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ تصور ایک محسوس پیکر اور وہ حقیقتِ منتظر ایک لباسِ مجاز میں مضطرب نگاہوں کے لئے وجہ شکیب ہوتی، وہ خود اس دنیا سے چل بسے۔ ورنہ حصولِ پاکستان کے بعد ان کی موجودگی شدید ضروری تھی اور فی الحقیقت یہی وقت تھا جب وہ ہمیں بتلاتے کہ اب اس خاک میں کس طرح رنگ بھرا جائے گا تاکہ اسے صحیح معنوں میں اسلامی مملکت بنا سکے۔ یہ اقبال کی عدم موجودگی ہی ہے جس کی وجہ سے پاکستان مل جانے کے بعد کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب اسے کیا کیا جائے۔ چونکہ اسلامی نظام کا صحیح تصور کسی کے ذہن میں واضح اور غیر مبہم طور پر موجود نہیں اس لئے خواب، کثرتِ تعبیر سے پریشان تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا اہل صرف اقبال تھا جس کی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قرآنی نے ان تمام مقامات کو بے نقاب دیکھ رکھا تھا۔ وہ آج ہم میں موجود نہیں کہ ہم اس سے جا کر پوچھ سکیں کہ آپ کے تصور کا پاکستان مل گیا ہے، اب فرمائیے کہ اسلامی آئین کی تشکیل کس طرح کی جائے۔ لیکن اس کا پیغام ہمارے پاس موجود ہے۔ جو درحقیقت قرآن ہی کی شرح و تفسیر ہے۔ ہم اس سے یہ متعین کر سکتے ہیں کہ مملکت کے متعلق اس کا نظریہ کیا تھا۔ مضمون زیرِ نظر میں یہ بتایا گیا ہے کہ اقبال نے مغربی اندازِ مملکت میں کیا کیا خرابیاں دیکھیں جن کی اصلاح قرآنی اندازِ مملکت کر سکتا ہے۔ اس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ صحیح اسلامی مملکت کے خط و خال کیا ہیں۔

(طلوعِ اسلام)

انسان کی اجتماعی زندگی کا تین شعبوں کے تحت مکمل تجزیہ کر سکتے ہیں۔ (۱) نظامِ حکومت (۲) نظامِ معیشت اور (۳) تدبیرِ منزل یا نظامِ عائلی۔

متمدن انسان کسی نہ کسی نظامِ حکومت کے تحت زندگی بسر کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا دنیا کی کسی نہ کسی مملکت سے تعلق ہو۔ مملکت کے ذریعہ ہماری زندگی کی اہم اور فوری ضرورت پوری ہوتی ہے۔ اگر مملکت نہ ہو تو ہمارے حقوق و فرائض کی دنیا افراتفری میں مبتلا ہو جائے۔ جدید سیاسی تصورات کے مطابق مملکت انسانوں کی ایک ایسی جماعت سے عبارت ہے جو کسی معین علاقہ میں قانونی اغراض کی تکمیل کے لیے منظم ہو اور جس میں حاکم و محکوم کا تعلق عادتاً پایا جاتا ہو۔ مملکت کا خارجی مادی پہلو یہ ہے کہ وہ دنیا کے کسی نہ کسی مخصوص گوشہ یا رقبہ میں ہوتی ہے کہ بغیر اس کے ہم اس کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایک ایسی جماعت جو منظم ہو لیکن کسی مخصوص خطہ پر یکجا آباد نہ ہو جدید سیاسی اصطلاح کے مطابق مملکت نہیں کہی جا سکتی۔

قیامِ مملکت کے لئے ظاہر ہے کہ انسانوں کی یکجا آبادی لازمی چیز ہے اور اس میں نظم و وحدت ہونا بھی ضروری چیز ہے۔ مملکت افراد کو اپنے ضبط و نظم کا پابند کرتی ہے۔ لیکن وہ خود کسی دوسرے مقتدر کی تابع فرمان نہیں ہوتی۔ ہر مملکت کے لئے خارجی سیاسی اثرات سے کامل طور پر آزاد ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ کسی دوسری مملکت کے ارادہ کی پابند ہوگی تو اس پر اصطلاحاً لفظ مملکت کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ مملکت اپنے منشاء کو مؤثر بنانے کے لئے اپنا اہتمام جن افراد کے سپرد کرتی ہے وہ حکومت (گورنمنٹ) کہلاتے ہیں۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ مملکت کے ارادہ اور مرضی کو عملی جامہ پہنائے۔ حکومتوں میں آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن مملکت اس وقت تک قائم و برقرار رہتی ہے جب تک کہ خارجی اثر یا اندرونی انتشار سے اس کی وحدت کو صدمہ نہ پہنچے اور اس کے تسلسل میں رخنہ نہ پڑے۔

جدید مملکت کی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) مذہب و اخلاق سے بے تعلق۔

(۲) ہمہ گیر ہونا اور

(۳) وطنیت کے تصور سے تقویت حاصل کرنا۔

اب ہم ان تینوں خصوصیات کے متعلق اقبال کے خیالات پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ اقبال کے تمام تر خیالات کا سرچشمہ اسلامی تعلیم ہے۔ وہ انسانی تمدن کے کسی شعبہ کے متعلق جب کبھی اظہارِ خیال کرتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی اسلامی اصول ہوتا ہے۔ جس کی کسوٹی پر وہ جدید تمدن کے اداروں کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

جدید مملکت کا دعویٰ ہے کہ وہ مذہب کے معاملہ میں بالکل غیر جانبدار ہے۔ اس کو اس امر سے بحث نہیں

کہ اس کے ارکان کا مذہب کیا ہے۔ وہ کس کی عبادت کرتے ہیں اور کیوں؟ مملکت کے افراد کا ہم مذہب ہونا بھی کچھ ضروری نہیں جب تک لوگ اپنی شہری ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہوں۔ مملکت ان سے یہ نہیں دریافت کرتی کہ تم کس خدا، مذہب یا نظام اخلاق کی پیروی کرتے ہو؟ جدید مملکت نہ صرف مذہب بلکہ اخلاقی بندھنوں سے بھی اپنے آپ کو آزاد تصور کرتی ہے۔ مملکت کے اس تصور کا سب سے پہلا علمبردار میکیاولی ہوا ہے۔ جس نے سیاست کو مذہب و اخلاق سے جدا رکھنے کی تعلیم دی۔

میکیاولی کے پیش نظر سولہویں صدی عیسوی کی عیسائیت تھی جس میں یقیناً کسی ذی فہم اور ہوشمند شخص کے لئے روحانی تشفی کا سامان مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ پھر اس کے سامنے شہنشاہ اور پاپائیت کی باہمی جنگ اور خود کلیسائی اداروں کے اندرونی انتشار اور زبوں حالی کے مناظر بھی ہوں گے۔ جن کے باعث اس نے مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کیا اور سیاست سے ان کا دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔ میکیاولی نے صاف صاف کہا کہ افراد چاہیں تو نجی طور پر مذہب و اخلاق کی پابندی کر سکتے ہیں۔ لیکن مملکت کو ان سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ مملکت کا فرض ہے کہ وہ اپنی بقاء و استحکام کے لئے، حصول قوت و اقتدار کے لئے کوشاں رہے چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ ہاں اگر مذہب و اخلاق سے سیاسی فوائد کے حصول میں مدد ملتی ہو تو عارضی طور پر انہیں استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میکیاولی نے اس ابن الوقتی کی حکمت عملی کو عین سیاست بتایا ہے۔ جس پر ہر کامیاب مدبر اور سیاست کار کے لئے عمل کرنا ضروری ہے۔ پچھلی چار صدیوں میں میکیاولی کی تعلیم کو یورپ میں جو قبول عام نصیب ہوا اس کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ اس باطل پرست فلارنسوی حکیم کی تعلیم نے حیلہ اندازی کو فن لطیف بنا دیا۔ اور سچ اور جھوٹ کو ایک صف میں لا کھڑا کیا۔ اقبال نے "رموز بیخودی" میں اس کی نسبت اس طرح ذکر کیا ہے۔

آں فلارنساوی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ بہر شہنشاہاں نوشت — در گل ما دانۂ پیکار کشت
فطرت او سوئے ظلمت بردہ رخت — حق ز تیغ خامۂ او لخت لخت
بتگری مانند آزر پیشہ اش — بست نقش تازہ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت — فکر او مذموم را محمود ساخت

بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد — نقد حق را بر عیار سود زد
باطل از تعلیم او بالیدہ است — حیلہ اندازی فنے گردیدہ است
طرح تدبیر زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایام ریخت

نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ کے اہل علم کی ذہانت و طباعی ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف ہونے لگی جو مملکت کو قوی کرنے والے احساس کی جنگی قوت میں اضافہ کرنے والے تھے چاہے ان کو برتنے میں اخلاق انسانی ہونی

ہی کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ میکیاولی نے مفاد پرستی کو اصول بنا دیا اور مملکت کو حق دیدیا کہ وہ اپنے استحکام کے لیے جو ذرائع بھی استعمال کرے وہ جائز ہیں۔ اس لئے کہ اصل چیز مقصد ہے نہ کہ ذریعہ۔ اگر کوئی مدبر اپنے اخلاقی اصول کی وجہ سے مملکت کو تھوڑا سا بھی عارضی نقصان پہنچاتا ہے تو میکیاولی کے نزدیک وہ مجرم ہے۔ میکیاولی نے اپنے خیالی بادشاہ کے لئے جو آزادیاں روا رکھی تھیں وہ تھوڑے دنوں بعد یورپ کے مطلق العنان حکمرانوں اور جمہوری حکومتوں کا طرۂ امتیاز بن گئیں، جن کے خلاف ضمیر انسانی کو اپنی آواز بلند کرنا پڑی۔

یونان اور روما میں مذہب و سیاست کو ایک دوسرے سے جدا نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ درحقیقت مذہب و سیاست کی ثنویت مسیحیوں کے ہاتھوں قائم ہوئی۔ جبکہ قیصر اور خدا کے حقوق الگ الگ پورا کرنے کی دعوت دی گئی۔ نشاۃ ثانیہ تک باوجود مملکت اور کلیسا کی جدائی کے یورپ میں عالمگیر سلطنت کا تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا۔ لیکن لوتھر کی تحریک اصلاح مذہبی کے بعد مختلف قومی گروہوں نے قیصریت اور پاپائیت کے جوئے کو اتار پھینکا اور جدید مملکتوں نے جنم لیا۔ شروع میں مطلق العنان حکمرانوں نے جدید مملکت کے استحکام کے فرائض انجام دیے اور پھر صنعتی انقلاب کے بعد جمہوریت اور پارلیمانی نظام حکومت کو فروغ ہوا۔ مستبد فرمانرواؤں کے "نظریۂ حقوق ربانی" کی جگہ جمہوریت کے نظریۂ "معاہدۂ عمرانی" کا چلن ہوا۔ جو جدید ثنویت کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں حکومت کی سربراہی چاہے "مطلق العنان فرمانرواؤں کے ہاتھوں میں رہی ہو یا جمہور کے قبضہ میں، ہر حالت میں مملکت کو مذہب و اخلاق سے جدا رکھنے کا میلان قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ آج نوبت یہ پہونچی ہے کہ مملکت اس کی مجاز ہے کہ انسانوں کے بے زبان گلّہ کو میکانکی طور پر اپنے قوت و اقتدار سے جدھر چاہے ہانکے۔ اگر مملکت افراد سے قتل و غارت کرانا چاہتی ہے تو ان کو کرنا ہوگا اور اگر وہ مذہب و اخلاق کے سلسلے میں مطالبوں کو توڑنے کی دعوت دے تو اس میں بھی کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے۔ مملکت کی قوت و جبروت کے فلک نما طلسم کو بے بس انسانیت آج غمزدہ آنکھوں سے دیکھ رہی ہے اور چوں نہیں کر سکتی۔

یورپ میں مذہب و سیاست کی تفریق جس تصور حیات کے تحت عمل میں آئی اس کی تہ میں روح اور مادہ کی ثنویت کا اصول کارفرما تھا۔ زندگی کے اس غلط نقطۂ نظر کے باعث انسانیت کا قافلہ مادیت کے بیابانوں میں آوارہ گرد ہے اور اسے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کدھر جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے؟

زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست بھی اس کی محتاج ہے کہ اس کی تہذیب کی جائے۔ یہ کام مذہب و اخلاق کے سوا اور کون انجام دے سکتا ہے۔ اسلام ہی کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے ملک و دین کی دوئی کو ختم کر کے زندگی کی فطری وحدت کو قائم و برقرار کیا اور اخلاق و اقتدار کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

انسانی زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کو روح اور مادہ کی ثنویت میں نہیں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کل کو اگر اجزاء میں بانٹا جائے تو اس کی اصلی حقیقت مسخ ہو جائے گی۔ ہم اپنے ہر دنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی اور معنوی نقطۂ نظر رکھتے ہیں جو در اصل ہمارے عقاید کا عکس ہوتا ہے۔ اگر نیت کا روحانی سرچشمہ گندا ہو جائے تو جو اعمال صادر ہوں گے وہ گندے اور خلوص و حقانیت سے مبرّا ہوں گے۔ افراد کی طرح اقوام کو بھی اخلاق کا پابند ہونا چاہیئے۔ ورنہ اجتماعی اعمال میں پراگندگی لازمی ہے۔ سعی و عمل کی دنیا میں اس کا امکان بظاہر نظر نہیں آتا کہ انسان اپنی اجتماعی زندگی میں اخلاق سے بے نیاز رہے اور انفرادی زندگی میں اس پر عمل کر سکے۔ اگر سیاست میں ظلم اور خود غرضی روا رکھی جائے گی تو ضرور ہے کہ اس تمدن کے سایہ میں جو افراد زندگی بسر کرتے ہیں وہ اپنی انفرادی زندگی میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بے مروتی اور خود غرضی سے پیش آئیں اور اس طرح اپنے وجود کی معنوی تنظیم کو تہ و بالا کر دیں۔ ہماری زندگی کا مخصوص نقطۂ نظر ہمارے سارے اعمال میں موجود رہے گا۔ چاہے ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ سیاست و اخلاق کی تفریق و بے تعلقی کے باعث جدید تمدن اپنی روحانی قدر و قیمت کھو بیٹھا ہے اور اس کی وجہ سے جو غیر متوازن صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس کا نقشہ ان اشعار میں کھینچا گیا ہے۔

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سمائی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سربلندی ہے، یہ سر بزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دیں کے لیے نامرادی
دوئی چشمِ تہذیب کی نابصیری

تمدن کا صحیح توازن اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جبکہ امور مملکت بھی اسی طرح نظام اخلاق کے پابند ہو جائیں جس طرح افراد ایک مخصوص ضابطہ پر عمل پیرا ہو کر اپنی مخفی قوتوں اور قابلیتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اخلاق و سیاست کی تفریق کسی ایک نظام حکومت کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ آج ہر نوع کی حکومت میں آپ کو جدید تمدن کا یہ مخصوص منظر نظر آتا ہے۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

انسانیت کی فلاح اس میں ہے کہ دین و دنیا اور اخلاق و سیاست ساتھ ساتھ رہیں۔ اور قوت و جبروت اور عجز و انکسار ایک دوسرے کے ہم رکاب ہوں۔ جنیدی و اردشیری کے امتزاج ہی سے ایسا نظام فکر و عمل وجود میں آ سکتا ہے جس کی بدولت انسانیت اپنی تقدیر کی تشکیل کر سکتی ہے۔ جدید تمدن کی سیاست ایک دیو بے زنجیر ہے کہ جدھر رخ کرتا ہے اپنے جلو میں تباہ کاریاں چھوڑ جاتا ہے۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاست لا دیں　　　کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد　　　فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

اخلاقی پابندیوں سے آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مملکت اپنے تئیں ہمہ گیر خیال کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ فرد اس کی خاطر اپنے آپ کو بالکل مٹا ڈالے اور اپنی تمام خواہشوں کو اس کی مشیت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے۔ اس کا جینا اور مرنا اسی کی خاطر ہو۔ مانگے تو اسی سے مانگے اور جھکے تو اسی کے آگے جھکے۔ جدید مملکت عہدِ حاضر کا سب سے بڑا بُت ہے۔ آج وہ فرد سے مکمل وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے اور وہی مرتبہ حاصل کرنا چاہتی ہے جو مذاہب میں ذاتِ باری تعالیٰ کو حاصل ہے۔

اقبال نے مملکت کے اس نئے بُت کا پول کھولا ہے۔ اس کے نزدیک اس سارے طلسم کے پیچھے ایک زبردست فریبِ نظر کا حجاب پڑا ہوا ہے۔ اگر وہ پردہ اٹھا جائے تو وہاں کچھ بھی نہیں۔ اپنی نظم "مسولینی" [illegible] "شہنشاہ" میں اس نے اسرارِ ملوکیت کو اس طرح فاش کیا ہے۔

ہو مبارک اس شہنشاہِ نکو فرجام کو　　　جس کی قربانی سے اسرارِ ملوکیت ہیں فاش
شاہ ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بُت　　　جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشکِ آمیز افیوں ہم غلاموں کے لیے　　　ساحرِ انگلیشیا! مارا خواجۂ دیگر تراش

مملکت کے ہمہ گیری کے دعووں کو اقبال صحیح نہیں سمجھتا۔ مملکت ایک انسانی ادارہ ہے۔ جو انسانوں کی خدمت کے لئے وجود میں آیا ہے۔ وہ مقصود بالذات نہیں کہی جا سکتی۔ مملکت محض اعتباری اور عارضی طور پر مقتدر ہے۔ اس میں الوہیت کی شان پیدا کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ اس ضمن میں اقبال کے تصورات اسلامی تعلیم سے ماخوذ ہیں۔ اسلام میں اقتدار سوائے خدا کے کسی کو حاصل نہیں جو ازلی اور ابدی اور واجب بالذات ہے۔ وہی کائنات کا حقیقی حکمران ہے۔ جب چاہتا ہے حکومت نوازش کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل و خوار کرتا ہے۔ لیکن وہ سب کچھ اپنے مقررہ قانون کے مطابق کرتا ہے۔ جس میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا سوائے اس کے کائناتِ ہستی میں کوئی مقصود بالذات نہیں ہے۔ مملکتی قانون اس وقت تک قابلِ احترام ہے جب تک کہ وہ حق کے موافق ہے۔ حق قانون سے پیدا نہیں ہوتا۔ قانون حق پر مبنی ہونا چاہیئے۔ جو واجب تعالیٰ کی عین مرضی ہے۔

قرآن پاک کی متعدد آیتوں میں اسلامی نظریۂ مملکت کی طرف اشارے ملتے ہیں جن سے مسلمان اپنا فلسفۂ سیاست اخذ کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہاں چند آیات شریفہ نقل کی جاتی ہیں۔

مالھم من دونہ من ولی ولا یشرک فی حکمہ احدا (الکہف)

اس کے سوا بندوں پر کوئی مختار نہیں اور وہ اپنے حکم و اقتدار میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

يفعل ما يشاء ۝ و يحكم ما يريد ۝ لم يكن له شريك في الملك

وہ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے، حکومت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

إن الحكم إلا لله

کسی کا حکم نہیں سوائے اللہ کے۔

فتعالى الله الملك الحق

بزرگ و برتر ہے اللہ جو حقیقی حکمران ہے۔

أليس الله بأحكم الحاكمين

کیا اللہ بہترین حاکم نہیں ہے۔

فالحكم لله العلي الكبير (المومن)

حکم تو وہی ہے جو خدا کا ہے۔ جو عظمت والا بڑا ہے۔

ألا له الحكم

بیشک اقتدار تو اسی کا ہے۔

ألم تعلم أن الله له ملك السموات والأرض

کیا تجھے معلوم نہیں کہ زمین اور آسمان کی حکومت اللہ ہی کی ہے۔

ان آیات شریفہ سے بخوبی واضح ہو گیا ہوگا کہ قرآنی تعلیم کی رو سے حکمرانی اور فرماں فرمائی کا حقیقی حق صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے، کہ اس سے بڑھ کر انسانی فکر و عمل کی رہنمائی کوئی نہیں کر سکتا۔ باقی سب پابندیاں حادثی اور اعتباری ہیں۔ انسان صرف اپنے اخلاقی نصب العین ہی کے آگے غیر مشروط طور پر سر تسلیم خم کر سکتا ہے۔ اقبال نے "اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل" میں اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے نہایت ہی لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام بہ حیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔ اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے۔ اور چونکہ ذات باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے، اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا در حقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (اعلیٰ صفات) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے۔

اقتدار کا یہ نظریہ جدید مملکت کے معاہدہ عمرانی کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے جس کی رو سے مشیت عامہ جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے ملکی اقتدار کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ نظریہ معاہدہ عمرانی کے علمبرداروں میں ہابز اور لاک کے علاوہ فرانسیسی مفکر روسو ہے۔ جس نے عوام کو اقتدار و حقوق کا سرچشمہ قرار دیا۔ اس کی

کی کتاب "معاہدہ عمرانی" انقلاب فرانس کی انجیل خیال کی جاتی ہے۔ روسو کی تعلیم سے انقلاب فرانس کے بیشتر قائد متاثر تھے۔ اسی تعلیم پر بعد میں جمہوری حکومتوں کا نظام فکر مبنی قرار دیا گیا۔ جب عوام دنیاوی اقتدار کا سرچشمہ ٹھہرے تو ظاہر ہے کہ اکثریت کا حکم چاہے وہ ناواقفیت اور نادانی کے باعث غلطی پر ہی کیوں نہ ہو، مطلق اور بے قید تسلیم کیا گیا اور انسانی ضمیر کی آواز جو ہمیشہ حق کی تائید میں بلند ہوتی ہے اور جس پر انسانیت کی سیاسی اور عمرانی ترقی کا دارومدار ہے، اکثریت کے فیصلے کے نیچے دبا دی گئی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا کوئی طرز مطلق حیثیت نہیں رکھتا۔ حکومت ایک با اختیار شخص کی یا متعدد با اختیار اشخاص کی یا بہت سوں کی اچھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ عدل و اعتدال کے اصول پر مبنی ہو، اور ایسی قوانین سے چشم پوشی نہ کرے جو فطری قوانین ہیں اور جنہیں ہر جماعت اپنے مزاج اور اپنے احوال کے مطابق برت سکتی ہے۔ اگر بجائے مشیت عامہ کے تسلیم کیا جائے کہ اقتدار کا ماخذ ذات باری ہے تو اس سے انسانی ضمیر کی آزادی کا اصول بھی مسلم رہتا ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ ترین اوصاف کے ذریعہ ہی سے قانون الٰہی کی توجیہہ کا مجاز ہے، اور جماعت کی عام ترقی کے راستے بھی مسدود نہیں ہوتے

اقبال کے نزدیک سلکی اقتدار کا ماخذ ذات باری ہے نہ کہ کوئی فرد اور نہ کوئی جماعت، چاہے وہ کسی خاص نقطۂ نظر کے متعلق کتنی ہی اکثریت کیوں نہ رکھتی ہو۔ وہ اصلی حاکم اس کو مانتا ہے جو دنیاوی اعتبارات و تقیدات سے پاک اور بذاتہٖ مطلق محض ہو کہ اسی کے آگے فطرت انسانی اپنی جبین نیاز جھکا سکتی ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتان آزری

دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ حاکمی کے لئے اگر فوج اور زندان و سلاسل معیار ہیں تو یہ بہت پست قسم کے معیار ہیں۔

فوج و زندان و سلاسل رہزنی است　　　او ست حاکم کز چنیں ساماں غنی است

جمال الدین افغانی کی زبانی اسی مسئلہ کے متعلق یوں کہلوایا ہے۔

غیر حق چون ناہی و آمر شود　　　زور ور بر ناتواں قاہر شود

زیر گردوں آمری از قاہری است　　　آمری از ماسوا اللہ کافری است

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال ہمیں نراج کے راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کا قائل ہے کہ انسانی فطرت اجتماعی زندگی کی متقاضی ہے۔ انسانوں کے ذہنی اور اخلاقی قوٰی بغیر مملکت کے وجود کے نشو و نما نہیں پا سکتے جب تک عدل و انصاف کو نافذ کرنے کے لئے کوئی نہ ہو، جو مفاد کلی کی نگہداشت کر سکے اس وقت تک معاشرہ ترقی تو کجا اپنے آپ کو قائم و برقرار نہیں رکھ سکتا۔ حکومت کسی ایک مخصوص طرز کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ مختلف حالات کے مطابق مختلف حکومتیں ممکن ہیں جو حق اور عدل پر مبنی ہو سکتی ہیں۔

اقبال کے نزدیک مملکت کی اطاعت غلامی نہیں۔ بلکہ خود انسانی نفس کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہے۔ اس طرح آدمی آدمی کا نہیں بلکہ الٰہی قوانین کا تابعدار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی انسانیت اور شرافت کو بٹا نہیں لگتا۔ حکمراں کی عزت و احترام وہ اس واسطے کرتا ہے کہ وہ فطری حقوق اور الٰہی نوامیس کا پاسباں ہے؛ اس لئے نہیں کہ وہ قوت و جبروت کا مالک ہے۔ زندگی کے اسی نقطۂ نظر کے باعث اسلامی تاریخ نے آزادی و خودداری کی روایات کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ اور اس کی بدولت مردِ مومن کی سیرت میں بے نیازی اور بے خوفی ہمیشہ موجود رہی۔ سیرت کے اس اعلیٰ وصف کو اقبال فقر سے تعبیر کرتا ہے

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ
علم کا موجود اور فقر کا موجود اور — اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰه
چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ
دل اگر اس خاک میں زندہ و بیدار ہو — تیری نگہ توڑ دے آئینۂ مہر و ماہ

اسلامی تاریخ میں یہ امر مسلم رہا ہے کہ حاکم حکمرانی کا مستحق وہاں اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ صفات عالیہ کا نگہبان ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبۂ صدارت میں بصراحت موجود ہے۔

ایها الناس قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان احسنت فاعینونی وان اساوت فقوموني، الصدق امانة والکذب خیانة والضعیف فیکم قوی عندی حتی اخذ له حقه والقوی ضعیف عندی حتی اخذ منه الحق اطیعونی ما اطعت الله و رسوله فاذا عصیت الله و رسوله فلا طاعة لی علیکم

(اے لوگو میں تمہارا ولی مقرر کیا گیا ہوں۔ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں بھلائی کروں تو مدد کرو۔ اگر میں برائی کروں تو مجھے تنبیہ کرو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ اس کا حق نہ دلوا دوں اور قوی ضعیف ہے جب تک کہ اس سے کمزور کا حق نہ لے لوں۔ میری اطاعت کرو اس وقت تک جب تک کہ میں اللہ اور رسول کی اطاعت کرتا ہوں۔ اگر میں اللہ اور رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر واجب نہیں۔)

غرض مملکت یا حکومت کا اقتدار اور اس کا ہمہ گیری کا دعویٰ اسلامی روایات میں ہمیشہ مشروط رہا ہے۔ الحکم بیدہ امر الملک للّٰه کا فلسفہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسانی صفات عالیہ ہی اس امر کو متعین کرنے کی مجاز ہیں کہ کونسا طرزِ حکومت کن حالات کے لئے موزوں اور قرینِ عدل ہے۔ عدل سے مراد ایسا نظامِ حیات ہے

جس میں جماعت کے ہر رکن کو اپنی صلاحیتوں کو ظاہر کرنے کا پورا موقع ہو اور وہ اجتماعی زندگی میں وہی حصہ اور رتبہ حاصل کر سکے جس کا فی الحقیقت مستحق ہے۔ بغیر اس کے کوئی مستحکم تمدن اور وسیع تہذیب وجود میں نہیں آسکتی۔

اس اصول کو تسلیم کرنے سے سیاست کسی بندھے ٹکے نظام فکر کی پابند نہیں ہو جاتی۔ بلکہ زندگی کی طرح وہ مختلف احوال کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتی ہے۔ ہمارے سیاسی نظامات جنہیں آج مطلق حقائق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے خاص حالات کا نتیجہ ہیں۔ وہ سب کے سب آنی و فانی ہیں ان میں کوئی بھی دائمی اور مطلق محض نہیں۔ باقی رہنے والی صرف ذات خداوندی ہے۔ ضرب کلیم میں محراب گل افغان کی زبانی اقبال نے نہایت بلیغ اشعار کہلوائے ہیں۔ محراب گل افغان کہتا ہے کہ افغانستان کی چٹانیں عالم سیاست کے عجیب عجیب انقلاب دیکھ چکی ہیں۔ انہوں نے سکندر کو بھی دیکھا اور نادر شاہ کو بھی۔ لیکن فاتحوں نے جو نظام حکومت قائم کئے وہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوئے۔

کیا چرخ کج رو، کیا مہر، کیا ماہ — سب راہرو ہیں واماندۂ راہ
کڑکا سکندر بجلی کی مانند — تجھ کو خبر ہے اے مرگ ناگاہ!
نادر نے لوٹی دلی کی دولت — اک ضرب شمشیر افسانہ کوتاہ!
افغان باقی کہسار باقی — الحکم للہ! الملک للہ

جدید مملکت کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نظام فکر کو وطنیت کے فلسفۂ اجتماعی پر مبنی قرار دیتی ہے۔ وطنیت ہی اس کا دین ہے اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اپنے اعمال کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے یہ وطنیت کے جذبہ کا سہارا لیتی ہے۔ جب مذہب کا دامن ہاتھ سے چھوٹا تو ضروری تھا کہ کوئی دوسرا مسلک یا زندگی کا نقطۂ نظر اس کی جگہ لیتا ہے۔ وطنیت کے تصور نے بڑی حد تک اس روحانی اور معنوی خلا کو اہل مغرب کی زندگی میں پر کیا جو ترک مذہب سے پیدا ہو گیا تھا۔ نظری حیثیت سے اصول قومیت کا تعلق انسانوں کی سیاسی گروہ بندی سے ہے۔ اس کے ذریعے سے اس تاریخی رجحان کا اظہار عمل میں آیا جس کا مقصد یہی عالمگیر مملکت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے آزاد اکائیاں قائم کرنا تھا۔ اس کی بدولت ایسی نئی سیاسی تنظیم وجود میں آئی جس سے مختلف گروہوں کی نسلی اور لسانی انفرادیت برقرار رکھی جا سکے اور ان میں سیاسی اور معاشی تعاون عمل کی راہ پیدا ہو اور سب کی دولت میں اضافہ ہو۔ اس تعاون عمل کی بہترین شکل یہ خیال کی جاتی ہے کہ ہر مملکت قوم ہو اور ہر قوم مملکت ہو۔

وطنیت کے تصور کا اظہار سیاست کے ذریعہ اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوا اور انقلاب فرانس نے اس تصور کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ بعد میں وطنیت کا اظہار مخصوص تہذیبوں کی ادبی، تاریخی اور لسانی خصوصیات کے ذریعے سے کیا گیا۔ وطنیت کے جذبہ کی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام ایک مشترک سیاسی ہیئت میں منسلک ہو گئے اور تاجرانہ نفع پرستی کی گرم بازاری کے لئے اہل مغرب کے یہ نئے حالات بہت سازگار ثابت ہوئے۔ تجارتی منافع میں

نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو جدید مملکتیں قائم ہوئیں انہیں وطنیت کے جذبہ سے معاشی مفاد کو فروغ دینے میں بہت کچھ مدد ملی۔ اس جذبہ کے نشو ونما میں بادشاہوں کا بڑا حصہ رہا۔ بالخصوص انگلستان اور فرانس میں قومیت انہیں کی مساعی کی رہین منت ہے۔ بالآخر قومیت کی قبا اہل مغرب کے جسموں پر ایسی چست ہوئی کہ اس کو بالکل فطری خیال کیا جانے لگا۔ ہر جماعت قومیت یا وطنیت ہی کی بنیاد پر اپنی سیاسی اور معنوی تنظیم کرنے کی دعویدار ہو گئی قومی اقتدار، معاشی قوت ونفوذ حاصل کرنے کا ذریعہ ٹھہرا۔ اور معاشی قوت سے قوموں کے سیاسی اقتدار کا اضافہ ہوا۔ ہر قومی مملکت اپنے معاشی مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مقدر کی تشکیل وتکمیل کے درپے ہو گئی، بلا لحاظ اس امر کے کہ دوسری جماعتوں پر اس کا کیا اثر مرتب ہوگا۔ جب ہر مملکت جو وضع قانون کا حق رکھتی ہے خود ہی اپنے حلقۂ عمل کا تعین کرنے لگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے میں اتنی عسکری قوت پیدا کرنے پر مصر ہوئی جو اسے اس کی دانست میں دوسری قوموں کی دست درازی سے محفوظ رکھ سکے، اور اپنے من مانے حقوق منوا سکے۔

مملکت کے جدید تصور میں قومی احساس کی کارفرمائی کا بڑا حصہ ہے۔ جس کی بدولت ہر چھوٹی سی چھوٹی قوم اپنی علیحدہ سیاسی تنظیم کی دعویدار ہے آج یہ سیاست کا ایک مسلم اصول مفروضہ مانا جاتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے مملکت اور قوم ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے پائیں۔ ان کے حدود ایک دوسرے سے الگ نہ ہوں بلکہ ایک ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوم کا تصور اب تک بہت غیر متعین اور مبہم طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن اس کی تہ میں اصلی خیال یہ ہے کہ جس جماعت میں لسانی، نسلی اور تہذیبی یگانگت ہو اس کے لئے بڑی حد تک ضروری ہے کہ اس کے سیاسی اور معاشی مفاد میں اشتراک پیدا کیا جائے۔ چنانچہ جدید قومیت ایک قسم کا نفسیاتی احساس ہے اور مملکت ایک معروضی حقیقت ہے جو اپنے ارادہ اور منشاء کو عملی جامہ پہنانے کی قوت رکھتی ہے۔ قومی مملکت بہترین سیاسی تنظیم ہے جو اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا محرک عمل ہے۔ آج اس نے دین واخلاق کی گدی پر قبضہ جمایا ہے۔ ملکی نظم ونسق کی وحدت اور معاشی مفاد کی یکسانیت سے قومیت کے جذبہ کو نشو ونما پانے کا بڑا موقع ملتا ہے جسے دوسری قوموں سے معاشی مقابلے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ آج قومیت یا وطنیت کا سیاسی تصور مملکت کی فطری بنا ر خیال کیا جاتا ہے۔ اقبال اس تصور کو اسلامی روایات کا نقیض خیال کرتا ہے۔ اور اس نئے بت کو توڑنا اپنا سب سے بڑا اسلامی فرض سمجھتا ہے۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور | ساقی نے بنا کی روشِ لطف وکرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور | تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے — غارت گر کاشانۂ دین نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے

اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ وطنیت کا جذبہ محض ایک مصنوعی چیز ہے - جدید تمدن کے بعض مخصوص حالات نے اس کی پیدائش ونشوونما میں مدد دی۔ یہ دعویٰ کہ جس طرح انسان کو اپنے خاندان یا قبیلہ سے محبت ہوتی ہے اسی طرح یہ محبت بڑھ کر قوم و وطن کی محبت بن جاتی ہے تاریخی ومنطقی طور پر صحیح نہیں ہے۔ خاندان کی محبت ایک قابل احساس جذبہ کے تحت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے وطنیت ایک پیچیدہ اور تجریدی احساس ہے جس کو صرف مخصوص تاریخی احوال اور معاشی تعلقات کی بدولت جذباتی حقیقت بننے کا موقع ملتا ہے۔ اور جہاں تاریخی حالات موافق نہیں ہوتے وہاں اس کے لئے باوجود معاشی مفاد کی یکسانیت کے جذباتی حقیقت بننے میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ خود ہندوستان کی مثال اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہے۔

نسل، زبان، سیاسی اور معاشی وحدت اور رسوم و روایات کی یکسانیت وطنیت کے جذبہ کے پیدا کرنے میں ممد ومعاون ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی عنصر بھی اجتماعی زندگی کی اساس نہیں کہا جا سکتا جس کے بغیر کسی گروہ کی معنوی تنظیم محال ہو۔ دراصل وطنیت کا جذبہ جدید تمدن کی بعض مخصوص ضروریات سے پیدا ہوا۔ اس کی عمر دو سو ڈھائی سو برس سے زیادہ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن اس عرصہ میں اس نے بے پناہ قوت حاصل کرلی ہے۔ وطنیت اس قوت کو نہایت ہی پست مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتی۔ اس نے من مانے طور پر اپنے اقدار حیات بنائے ہیں، جنہیں وہ حق و باطل کا معیار خیال کرتی ہے۔ اس اندھے جذبہ کے تحت قومیں یہ بھول گئیں کہ جس طرح انفرادی زندگی میں خواہشوں اور میلانوں کی تحدید سے اخلاق وتمدن پیدا ہوئے، اسی طرح قومیں جب تک اپنے اعمال پر تحدید حاصل کرنا نہیں سیکھیں گی، اس وقت تک یہ دنیا اسی طرح جہنم زار بنی رہے گی جیسی کہ آج کل بنی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے قدیم آریاؤں، یونانیوں اور جاہلیت کے عربوں میں اس قسم کے تصورات ملتے ہیں کہ وہ اپنی زبان بولنے والوں کے علاوہ دوسروں کو وحشی سمجھتے تھے۔ اس قسم کی خوقیت کا احساس اسلام سے قبل اکثر گروہوں میں موجود تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے ان نسلی اور نسبی تفضیلوں کو معدوم قرار دیا۔ جن کی وجہ سے شرافت اور بزرگی کسی خاص قبیلہ یا گروہ کی طرف منسوب ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ اس نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کہہ کر انسانی اعمال کو شرف واحترام کا مستحق ٹھہرایا، نہ کہ نسلی ونسبی تعلق کو۔ اسلامی روایات میں وسیع تر انسانیت کا تصور پیش نظر رہا نہ کہ مخصوص اور محدود گروہوں کا۔ مخصوص گروہ تو اس سے

پیدا کئے گئے ہیں کہ وہ آپس میں پہچانے جا سکیں جیسا کہ آیت شریفہ میں ہے۔

یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور پھر تمہاری قومیں قبیلے بنا دیئے تاکہ تمہیں ایک دوسرے کی پہچان ہو سکے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلعم نے نسل و نسب کے تفاخر کا مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جبکہ آپ نے فرمایا۔ لیس للعربی فضل علی العجمی ولا للعجمی فضل علی العربی کلکم ابناء ادم وادم من تراب۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔

اقبال نے اسلام کے رنگ و نسل و قوم سے بالاتر ہونے کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ وطنیت کے جذبہ کو جو ایک انسان کو دوسرے انسان میں مصنوعی فرق قائم کرتا ہے، بت پرستی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان تکرار گری اور بت پرستی کی ایسی خوگر رہی ہے کہ جب تک ایک بت ٹوٹ جاتا ہے وہ دوسرا بنا یا تراش لیتی ہے۔ نت نئے بت تراشنے کا سلسلہ قدیم زمانے کی طرح آج بھی جاری ہے۔ ان بتوں کی چاہے شکلیں تھوڑی بہت بدل گئی ہوں ورنہ ان میں کوئی بڑا فرق نہیں۔ آج انسانی گروہوں نے وطنیت کا نیا بت تراشا ہے۔ جس کے آگے وہ سربسجود ہیں۔ اس بت پر بلا تکلف و تامل انسانیت کو بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس کا دعویٰ ہے کہ جس طرح دوسرے بت توڑے گئے ضرور ہے کہ اس بت کو بھی توڑا جائے تاکہ انسانیت کی گلو خلاصی ہو۔

این کہ انساں بت پرستے بت گرے	ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است	تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب	نام او رنگ است ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند	پیش پائے ایں بت نا ارجمند
اے کہ خوردستی ز مینائے خلیل	گرمی خونت ز صہبائے خلیل

بر سر ایں باطل حق پیرہن
تیغ لا موجود الا ھو بزن

اسلام کی قدیم روایات ہمیشہ وسیع تر انسانیت کے حقوق کی علمبردار ہیں نہ کہ مخصوص گروہوں کے عارضی معاشی مفاد کی۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے لوگوں نے آپ کے خاندان کی نسبت جب دریافت کیا تو آپ نے جواب دیا تھا۔ سلمان ابن الاسلام ۔ یہ جواب ایک شخص کا جواب نہیں بلکہ ایک تہذیب کا جواب ہے

جو اس نے زندگی کے ایک نہایت ہی اہم مسئلہ کو حل کرنے کی غرض سے دیا تھا۔ اقبال نے اسی واقعہ کو اپنے اس شعر میں نقل کیا ہے۔

فارغ از باب و ام و اعمام باش
ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش

جس طرح اسلام نے خاندانی شرف کو معدوم کر دیا اُسی طرح اس نے آب و گل کی فضیلت کو بھی جس سے وطنیت عبارت ہے، اپنے نظام اخلاق میں کوئی جگہ نہیں دی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کو جس سرزمین سے تعلق ہوتا ہے اس سے وہ مانوس ہو جاتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز اسے بھلی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ انسانی روح خاک کی پستیوں میں اپنے تئیں ایسی آلودہ کرے کہ اس کی قوت پرواز جاتی رہے۔ ہندی۔ ایرانی۔ اور تورانی سے بالاتر ملت اسلامی کی روحانی ہستی ہے۔ جو کسی خطۂ زمین میں مقید نہیں ہو سکتی۔

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی　　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

دوسری جگہ کہا ہے۔

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی　　　خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند
درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی　　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

ہندی اور تورانی سے پیشتر آدمی آدمی ہوتا ہے۔ اس کی آدمیت کسی خطے سے وابستہ ہونے سے پہلے ہی وجود میں آتی ہے۔ اقبال کہتا ہے کہ میں پہلے تو آدم بے رنگ و بو ہوں، اس کے بعد جو چاہو نام رکھ لو۔

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی　　　تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدم بے رنگ و بویم　　　از ان پس ہندی و تورانیم من

اقبال وطن دوست ہے لیکن وطنیت سے بیزار ہے۔ وہ اس کو اسلام کی عالمگیر روح کے منافی تصور کرتا ہے۔ اس مسئلہ پر اس نے مارچ ۱۹۳۸ء میں ایک مضمون شایع کیا تھا جس میں تفصیل سے وطنیت کے فلسفہ پر بحث کی تھی۔ اس مضمون کے بعض اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

> اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اُس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی

مگر سیاسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخِ ادیان اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ قدیم زمانہ میں "دین" قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار دیا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے۔ اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف سٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوعِ انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ "دین" نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد باوجود فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا "دستورالعمل" قوم و نسل پر بنایا نہیں جا سکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک "اُمت" کی تشکیل اور اس کے بقا کے لئے ضروری ہے۔ کیا خوب کہا مولانا رومؒ نے کہ

ہم دلی از ہم زبانی بہتر است

"قدیم الایام سے اقوام اوطان کی طرف اور اوطان اقوام کی طرف منسوب ہوتے چلے آئے ہیں۔ ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ہم سب کرۂ ارض کے اس حصہ میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہند کے نام سے موسوم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چینی، عربی، جاپانی، وغیرہ۔ وطن محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور اس حیثیت سے اسلام سے متصادم نہیں ہوتا۔ ان معنوں میں ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے...... مگر زمانۂ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا اور اسی اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے"

اقبال کے بعض اشعار سے ناواقف لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا کہ وہ فلسفۂ شاہین کو کھُلّم کھُلّا سراہتا ہے اس لئے اس کے نزدیک قوی اقوام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کمزوروں کو اپنا غلام بنائیں۔ لیکن شاید اقبال کے بعض اشعار سے یہ غلط نتیجہ اس لئے نکالا گیا کہ وہ بے عملی اور کمزوری کو انسان کی سب سے بڑی لعنت خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک مظلوم بھی ایک طرح کا ظالم ہے کہ وہ دوسروں کو ظلم کرنے کا موقع دیتا ہے۔ در اصل

اس کی دلی تمنا ہے کہ کمزور جماعتیں اپنی شکوہ گری اور سستی چھوڑ کر زبردست بن جائیں تاکہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" اور دوسرے کلام میں کمزوروں کو طاقتور بننے کا طریقہ بتایا ہے۔ لیکن وہ اس طاقت کو مطلق اور بے قید نہیں دیکھنا چاہتا۔ انسانیت اور اخلاق کی پابندیاں عاید کرتا ہے۔

اقبال ملوکیت یا امپیریلزم کو جارحانہ وطنیت ہی کا ایک شاخسانہ تصور کرتا ہے۔ اور اس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم کی ضد خیال کرتا ہے۔ قومیت کے علمبرداروں کا نظریہ "میرا وطن غلط ہو یا صحیح برحق ہے"۔ یہ جوڑی عصبیت حق و باطل میں تمیز نہیں کرنے دیتی۔ جب آدمی سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اور اپنے عمل کو حق بجانب ٹھہرا سکتا ہے۔ جدید مملکت اور سرمایہ داری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس طرح سرمایہ داری قومی دولت میں اضافہ کے لئے نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں رہتی ہے، اسی طرح ملوکیت جو وطنیت ہی کی ایک شکل ہے، نئے نئے علاقوں کو فتح کر کے اپنا پھریرا اڑانا چاہتی ہے اور اپنے اقتدار کے حدود دنیا کے ہر گوشہ میں وسیع کرنے کی متمنی رہتی ہے۔ اس کو اپنا اقتدار وسیع کرنے سے کام، چاہے خدا کی بے بس مخلوق پر کچھ بھی گزرے۔ آل انڈیا ریڈیو لاہور کی استدعا پر یکم جنوری ۱۹۳۸ء سال نو کے موقع پر اقبال نے جو پیغام دیا تھا اس کا ایک ایک لفظ انسانیت دوستی کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔ اس پیغام سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوت کے استعمال کو صرف اسی وقت جائز سمجھتا ہے جبکہ وہ اخلاقی مقاصد کے لئے ہو نہ کہ جوع الارض کے لئے۔ اس پیغام کے الفاظ یہ ہیں:

"دور حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے۔ اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں۔ اور انسان نے فطرت کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ ان نقابوں کی آڑ میں قدر حریت اور شرف انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال نہیں پیش کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی ہے وہ خونریزی، سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسانوں کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں، انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگان خدا کو ہلاک کر ڈالا صرف اس واسطے کہ ان کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔"

انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ان کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، اُن کے ادب اور اُن کے اموال پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر ان میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خون ریزی اور برادرکشی میں مصروف کر دیا، تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ اُن کا لہو پیتی رہے۔ جو سال گزر چکا ہے اس کو دیکھو اور نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی واقعات پر نظر ڈالو تو معلوم ہو کہ اس دنیا کے ہر گوشے میں چاہے وہ فلسطین ہو یا حبش، ہسپانیہ ہو یا چین ایک قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردی سے موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ تمام دنیا کے ابنائے فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا یہی انجام ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔ دراصل انسانیت کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی قوتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان، ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی مسئلوں کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے تمدن کا نام و نشان مٹا رہے ہیں۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل و زبان و رنگ سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت پرستی کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا جب تک جغرافی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے امتیازات کو نہ مٹایا جائے گا، اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے، اور اخوت، حریت اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔"

اقبال کو ہر اعلیٰ جذبات رکھنے والے شخص کی طرح وطن سے محبت ہے۔ لیکن وہ وطنیت سے بیزار ہے جو ایک مستقل نظریۂ حیات ہے جس کی تبلیغ سب سے پہلے مغربی دنیا میں مخصوص اغراض کے تحت ہوئی۔ بدقسمتی سے ہندوستان کے نام نہاد وطن پرستوں نے بھی اہل مغرب کی ریس میں ہندوستان کی ہیئت اجتماعیہ کے نشو و نما کے لیے انہیں اصولوں

کو اختیار کرنا ضروری سمجھا جو یورپ میں جنگ و فساد کا موجب ثابت ہوئے ہیں۔ اور جو اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں. مغربی تصورات کے تحت اس ملک کی اکثریت نے ہندوستان کی ہیئت اجتماعیہ کی تنظیم کے لئے جو نقطۂ نظر اختیار کیا وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی روایات کے نقیض تھا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس سے مسلمانوں کی باطنی ہم رنگی اور اشتراک احساس کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں اجلاس (الٰہ آباد) میں اقبال نے ہندوستان کی متحدہ قومیت اور اس ملک کے مشترک مفاد کے متعلق جو اظہار خیال کیا وہ اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس خطبہ میں اقبال نے بتایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ ان علاقوں میں جہاں انہیں اکثریت حاصل ہے اس قابل ہوں کہ اپنی تہذیب و روایات کو آزادی کے ساتھ ترقی دے سکیں۔ اس غرض کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ فرنگی جمہوریت کے اصول اس ملک کے مخصوص حالات کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ اقبال نے اسلامی ہند کی سیاسی تشکیل کے تصورات کو سب سے پہلے اس موقع پر پیش کیا۔ جس کی رو سے پنجاب، صوبہ سرحدی، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک علیحدہ مملکت قائم کی جائے جس کو حکومت خود اختیاری کے تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

اقبال جدید مملکت کی جمہوری تنظیم کو ہر ملک کے لئے موزوں نہیں سمجھتا۔ یہی جمہوریت جو کمزور قوموں کے حقوق کی علمبردار بن کر اٹھی تھی آج ملوکیت کے پست مناظر دنیا کے سامنے پیش کر رہی ہے۔ فرانسیسی جمہوریت کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انقلاب کے وقت "قوم زندہ باد" کا جو نعرہ بے بس مخلوق کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بلند کیا گیا تھا وہی بعد میں جمہوری فرانس کی سلطنت کو وسیع کرنے اور دوسروں کو غلام بنانے کیلئے استعمال کیا گیا۔ قوت و اقتدار کا جذبہ جدید تمدن دنیا کا سب سے زیادہ موثر جذبہ ہے جس کا شکار خود جمہوریتیں بن گئیں۔ پھر موجودہ جمہوریت کے خارجی مظاہر ایسے ٹھیس پہنچنے زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والے اور غیر مستحقین کو سیاسی اقتدار کی گدی پر بٹھانے والے ہیں کہ اگر اقبال بھی اس دور کے دوسرے نامور مفکروں کی طرح ان سے بیزار ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جمہوریت کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کی بدولت انسانی ذمہ داری کے اصول کو سخت ٹھیس لگتی ہے۔ اس نظام کے تحت وہ لوگ کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتے جو ایسا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں بلکہ عوام پر اپنی رائے کی تشکیل کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ انسان بھی خود کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے تئیں خارجی قوتوں کا کھلونا تصور کرتا ہے۔ زمانہ کی آندھیاں اسے کبھی ایک طرف اڑا لے جاتی ہیں اور کبھی دوسری طرف۔ اپنے اخلاقی معیار سے حالات اور واقعات کو جانچنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنے ضمیر کے فیصلہ کو بھی دوسرے کی رائے کا پابند کر دیتا ہے۔ اس کا نہ کوئی سیاسی عقیدہ ہوتا ہے اور نہ کوئی عمرانی نصب العین جس کی روشنی میں وہ اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے۔ زندگی اس کے لئے ایک بھول بھلیاں ہے جس میں وہ ایک اندھے آدمی کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے۔

جب کوئی واضح منزل اس کے سامنے نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کو آگے بڑھنے اور حالات بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہی حالات ہیں جن کے باعث جدید عمومی مملکتیں حرکت اور عمل کے لئے اخلاقی اور روحانی محرکات کی متلاشی ہیں کہ بغیر ان کے ان کا وجود خطرہ میں ہے

انسانیت کے تمام اہم فیصلوں کو جو زندگی کے رُخ کو بدلنے والے ہوں محض تعداد کے تابع کر دینا انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ جمہوریت کا بڑا عیب جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ شمار کرنا تو جانتی ہے۔ لیکن وزن کرنا نہیں جانتی۔ جس کے بغیر ہیئت اجتماعی میں عدل و اعتدال قایم نہیں رہ سکتا۔ اقبال نے جدید جمہوریت پر متعدد جگہ اپنے مخصوص انداز میں تنقید کی ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

دوسری جگہ کہا ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردہ میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

اقبال حقیقی آزادی کی روح کا مخالف نہیں۔ آزادی خودی کی پرورش کے لئے ضروری ہے۔ غلامی کی بے آب و رنگ زندگی انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ وہ خود آزاد منش شخص تھا اور دوسروں میں بھی آزادی کا جوہر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کو اس امر کا قوی احساس تھا کہ افراد میں اعلیٰ بصیرت فکر و نظر صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ آزادی کی ہوا میں سانس لیتے ہوں۔ اس کو غلاموں کی بصیرت میں ہمیشہ شبہ رہا۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

معروضہ بالا مطالب سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اقبال اجتماعی زندگی کے لئے نظام حکومت کی ضرورت کا تو قائل ہے۔ لیکن اس کی کسی مخصوص اور خارجی شکل کو مطلق اور دائمی نہیں سمجھتا۔ اس کا طرز حکومت صحیح اور موزوں ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس سے اعمال انسانی نتیجہ خیز بنتے ہوں اور نظام عدل نافذ ہوتا ہو جو اس کی وجہ وجود ہے۔ اگر حکومت اس مقصد کو پورا نہیں کرتی، تو وہ بے سود ہے۔ چاہے اس کی اصطلاحیں کتنی ہی مرعوب کن کیوں نہ ہوں۔ اس خیال کے علاوہ اس کے سیاسی افکار میں قدر حریت کو خاص اہمیت حاصل ہے وہ انسانی روح کی آزادی کا علمبردار ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہر گروہ کی خود مختاری[1] کا قائل ہو۔ جدید ملوکیت کی خصوصیات کے متعلق اس نے اپنے مخصوص انداز میں تنقید کی ہے۔ وہ اس کی جارحانہ وطنیت اور ملوکیت، اخلاق سے اس کی بے تعلقی اور اس کے جھوٹے جمہوریت کے دعووں سے بیزار ہے وہ دنیا میں ایسا نظام حکومت دیکھنے کا متمنی ہے جو وسیع تر انسانیت کے ارتقاء میں حارج ہونے کے بجائے ممد و معاون ہو۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جبکہ سیاست بھی تمدن کے دوسرے شعبوں کی طرح بے قید اور مطلق العنان نہ رہے بلکہ ضابطہ آئین[2] اور اخلاق کی پابند ہو جائے۔ اقبال کے نزدیک وہی سیاست حقیقی ہے جو مصالح کلی کی نگہبان ہو نہ کہ جزئی مفاد کی جسے افادی نقطۂ نظر کے مطابق اکثریت کے ذریعے متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چونکہ سیاسی نظام دائمی نوعیت نہیں رکھتا۔ اس لئے انسانیت کو اس کا پورا موقع حاصل رہتا ہے کہ وہ نئے حالات کے مطابق ازلی و ابدی، اخلاقی اصولوں کے تحت اپنی معنوی تنظیم عمل میں لاتی رہے۔ اور اپنے احوال و ضروریات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتی رہے۔ ضرور ہے کہ اس تنظیم میں انفرادی اقدار جیسے آزادی عزت نفس اور ذاتی وقار برقرار رہیں اور ساتھ ہی ہیئت اجتماعی کی مجموعی نشوونما اور نظام امن و عدل میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ سوائے اس صورت کے مملکت اپنے منشا کو پورا نہیں کر سکتی۔

---

[1] ان ہی حدود کے اندر جو قرآن کریم نے متعین کی ہیں۔ (طلوع اسلام)

[2] یعنی آئین خداوندی کی (طلوع اسلام)

مرقدِ قائدِ اعظم سے.....
شعرا کو خطاب

مرقدِ قائدِ اعظم سے صدا آتی ہے
عزم کم یاب سہی قوم میں، نایاب نہیں
شاعرو جاگ اٹھو تم تو جگا سکتے ہو!
قوم اپنی کوئی ایسی بھی گراں خواب نہیں

ایک شاعر کی نوا نے مجھے بخشی تخئیل
اُسی پُرسوز نوا نے مجھے ہشیار کیا
صاحبِ بانگِ درا، محرمِ اسرارِ خودی
جس نے اس قافلۂ خفتہ کو بیدار کیا

اس سے بڑھ کر بھی قیامت کوئی اور آئے گی
جو نکالے گی تمہیں خواب کے گہواروں سے؟
منتظر کیا ہو کسی اور تباہی کے ابھی
رونقیں چھین کے لے جائے جو بازاروں سے؟

قوم طوفانِ معاصی میں گرفتار ہے آج
اور تم خود اسی طوفاں میں بہے جاتے ہو
وہی گائے ہوئے نغمے ہیں تمہارے لب پر
وہی افسانۂ پارینہ کہے جاتے ہو

آتش و خوں کے تلاطم میں کئی ڈوب گئے
اور کئی بچ کے نکل آئے ہیں بسمل ہو کر
جس طرح ہوں کسی نوشے کے براتی سرشار
محوِ نغمہ ہو تم آسودۂ ساحل ہو کر

تم مسلمان ہو، اسلام کے فرزند ہو تم
یاد اسلام کا کچھ حق بھی تمہیں ہے کہ نہیں؟
شرم آتی ہے مگر تم کو مسلمانی سے
اس سے آگے نہ شکن دامنِ فیشن پہ کہیں

داورِ حشر کے ہاں شعر نہ کام آئیں گے — پر کہاں داورِ حشر اور کہاں اہلِ ادب
وقتِ شمشیر و سناں، رغبتِ طاؤس و رباب — یہ تساہل، یہ تغافل، یہ قیامت، یہ غضب

صحتِ فکر ہوئی اکبر و اقبال پہ ختم — کام اب چلتا ہے اک جدتِ لایعنی سے
کچھ ترنم کا سہارا ہے کچھ الفاظ کا کھیل — اپنے شاعر کو سروکار نہیں معنی سے

شعر میں مغز نہیں، روح نہیں، سوز نہیں — محض الفاظ و تراکیب کی صنعت کب تک
تا بکے ملکِ براہیم میں آذر کی تراشش — بُت و بُت خانہ کی رسموں کی حمایت کب تک

خاص نمبر یہ رسالوں کے ضخیم اور جمیل — اور یہ خاص اڈیشن جو ہیں اخباروں کے
سر بسر مظہرِ افلاسِ بضاعت ہیں تمام — وہی پامال مضامین ہیں بازاروں کے

یہ کھلونے ہیں بہل جاتے ہیں ان سے اطفال — فکرِ بالغ کے لئے ان میں کوئی ذوق نہیں
کاغذی پھول ہیں خوش رنگ مگر بے خوشبو — راحتِ خاطر و آسودگیٔ شوق نہیں

بوڑھے شاعر بھی غزل گو ہیں جوانوں کی طرح — عاشقی ختم ہوئی اب ہے فقط نقالی
کارِ شاں مرضِ شہرت و خبطِ تحسیں — قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

مرقدِ قائدِ اعظم سے صدا آتی ہے

عزم کم یاب سہی قوم میں نایاب نہیں
شاعرو جاگ اٹھو تم تو جگا سکتے ہو!
قوم اپنی کوئی ایسی بھی گراں خواب نہیں

عرشی
دار القرآن - لاہور

سرودِ رفتہ

یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی طرف سے، لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ایک پیغام نشر ہوا تھا جو تہذیب حاضرہ پر ایک حقیقت افروز تنقید اور انسانی فلاح و فوز کی طرف راہ نمائی کے لئے ایک شمع ہدایت تھا۔ اس پیغام کو نشر ہوئے آج گیارہ برس سے زائد عرصہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ کوئی حقیقت مرورِ زمانہ سے پرانی نہیں ہوا کرتی، اس لئے یہ آج بھی ویسا ہی پیغام عبرت و بصیرت ہے جیسا اس وقت تھا۔ یہ آخری پیغام تھا جو اس دیدہ ور کی طرف سے اقوامِ عالم تک پہنچا اور جسے ہم آج غم و مسرت کے مخلوط جذبات سے پھر اقوامِ عالم تک پہنچانے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

[طلوعِ اسلام]

پیغام

دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے۔ اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں۔ اور انسان قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور قوائے فطرت کی تسخیر میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے۔ لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت۔ قومیت، اشتراکیت۔ فسطائیت اور نہ جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی تجارت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی سفاکی اور زبردست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے نوامیس عالیہ کی حفاظت کریں۔ انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں۔ اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح بلند کریں۔ انہوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک اور پامال کر ڈالا۔ صرف

اس لئے کہ اُن کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا وہوس کی تسکین کا سامان بہم پہونچ جائے۔ انہوں نے کمزور قوموں پر تسلط حاصل کرنے کے بعد اُن کے اخلاق، اُن کے مذہب، اُن کی معاشرتی روایات اُن کے ادب اور ان کے اموال پر دست تطاول دراز کیا۔ پھر اُن کے درمیان تفرقہ انگیزی کرکے اُن بدبختوں کو خوں ریزی اور برادرکشی میں مصروف کردیا تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش اور غافل رہیں اور استعمار کی جونک چپ چاپ ان کا لہو پیتی رہے۔

جو سال گزر چکا ہے اس کو دیکھو اور آج نوروز کی خوشیوں کے درمیان بھی دنیا کے واقعات پر نظر ڈالو حبش ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین اس خاکدان ارضی کے گوشے گوشے میں یہی قیامت برپا ہے۔ لاکھوں انسان بیدردانہ موت کے گھاٹ اتارے جا رہے ہیں۔ سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدن انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں۔ وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں اور ضعیفوں کے خون کے آخری قطرات تک چوس رہی ہیں۔ غرض ایک ہنگامہ محشر ہے جس میں نفسی نفسی کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ تمام دنیا کے مفکر دم بخود ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر اس کرّے پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔

یاد رکھو! انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کردیں گی یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے ایک نسل، ایک زبان۔ ایک مذہب اور ایک قوم رکھنے کے باوجود محض اقتصادی عقائد کے اختلاف پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں۔ اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت۔ اس ناپاک قوم پرستی اور ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا، جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے الخلق عیال اللہ کا قائل نہ ہو جائے گا۔ جب تک جغرافیائی وطن، نسل اور رنگ کا امتیاز کالعدم نہ ہو جائے گا۔ انسان اس دنیا میں خوش و کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت۔ حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے۔

آؤ! اس نئے سال کو اس دعا سے شروع کریں۔ کہ خدائے بزرگ و برتر ارباب حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور انہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔ آمین!

(بقیہ ۱۶) اقبال کے جاوید نامے کے متعلق اکثر اوقات کہا جاتا ہے کہ اس کا پلاٹ دانتے کی *Divine Comedy* سے ماخوذ ہے۔ شاید دانتے کی تصنیف کا اثر اقبال پر ایک حد تک ہوا ہو مگر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ خود دانتے کا یہ تصور رسول کریمؐ کے معراج کے واقعے اور ابن عربی کی فتوحات مکیہ پر مبنی ہے۔ بہر حال دانتے کا مقصد جنت اور جہنم کے تفصیلی مناظر پیش کرنا تھا۔ اس کی تصنیف میں تاریک گہرائیاں لپکتے ہوئے شعلے، جلتی ہوئی روحیں، اور بھیجے ہوئے قلوب نظر آتے ہیں۔ اور اس کا تصور ان محسوس پیکروں سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کے برعکس اقبال کے جاوید نامے میں اس قسم کی تفصیلی تصاویر ناپید ہیں۔ انہیں مختلف روحوں اور ان کے مختلف مقامات سے واسطہ ہے اور وہ ان روحوں سے جو مکالمہ کرتے ہیں اس سے مقصد ہمارے لئے ایک مستقل پیغام ہے۔ نالۂ ابلیس کے عنوان سے جاوید نامہ میں جو نظم ہے وہ اس قدر بلند اور دور حاضر کے انسان پر اس قدر کڑی گہری اور لطیف تنقید ہے کہ اس کی مثال دنیا کے ادب میں کہیں مشکل ہی سے ملے گی۔ کم از کم دانتے، گوئٹے وغیرہ کے ہاں تو کوئی مثال نہیں ہے۔

اقبال کے تاثراتِ مغرب کے متعلق ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے کیونکہ اس عنوان کے ضمن میں اقبال کا سارے کا سارا کلام زیر بحث آجاتا ہے۔ میں صرف چند اشارات کر سکا ہوں اور ابھی بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا جا سکا۔ مثلاً آئن شائن کے نظریہ اضافیت اور نظریۂ وقت کے متعلق اقبال کے خیالات۔ آسوالڈ سپینگلر کی تصنیف انحطاطِ مغرب میں اسلام کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس پر اقبال کی تنقید۔ یا مارکس اور لینن کی اشتراکیت کے متعلق اقبال کے تاثرات وغیرہ۔ اس کے علاوہ اقبال کی شاعری میں جا بجا مغربی شعراء کے کلام کے ترجمے ہیں اور کہیں کہیں خفیف اشارے۔ مثلاً اقبال کی ایک پرانی نظم ہے جس کا عنوان ہے "فراق" دو شعر ہیں۔

یہ کیفیت ہے میری جانِ ناشکیبا کی
میری مثال ہے طفلِ صغیر تنہا کی
اندھیری رات میں کرتا ہے وہ سرود آغاز
صدا کو اپنی سمجھتا ہے غیر کی آواز

ان اشعار میں ٹینیسن کے *In Memoriam* کے مشہور اشعار کی خفیف سی جھلک ہے۔

So runs my dream, but what am I
An infant crying in the night,
An infant crying for the light,
With no language but a cry.

اقبال کے کلام کے مغربی عناصر کے متعلق بہت سی غلط رائیں قائم کی گئی ہیں۔ اقبال کی فکر بجائے خود مستقل اقدار کے تابع تھی اور انہوں نے مشرق و مغرب سے جو کچھ اخذ کیا ہے، ان اقدار کی وضاحت یا تائید کیلئے کیا ہے، کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان کراچی)

یہ نظم ۲۲ اپریل ۱۹۴۹ء کو یوم اقبال کے موقع پر پڑھی گئی۔
اور کراچی ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہوئی۔

شاعر کے تخیل کی تاثیر نظر آئی
اک مملکتِ نو کی تعمیر نظر آئی

اب صورتِ آئینہ روشن ہے وہی عالم
جس کی کبھی دھندلی سی تصویر نظر آئی

جو خواب کہ دیکھا تھا اُس مردِ قلندر نے
اُس خواب کی کیا دل کش تعبیر نظر آئی

کیسا دلِ دانا تھا، کیا دیدۂ بینا تھا
فاش اُس کو مسلماں کی تقدیر نظر آئی

مومن کی فراست میں پرتو ہے مشیت کا
تدبیر میں تنویرِ تقدیر نظر آئی

کس سے یہ اسیروں نے آداب جنوں سیکھے
اک جست میں دو ٹکڑے زنجیر نظر آئی

دُنیا پہ ہوا ظاہر تب زورِ قلم اُس کا
جب قوم کے قبضے میں شمشیر نظر آئی

محفل نے اسدؔ جس کو شاعر کا سخن سمجھا
اُس میں ہمیں قرآں کی تفسیر نظر آئی

اسدؔ ملتانی

نشانِ منزل

(بیسویں صدی کے ربع اول تک مسلمانانِ ہند کی سیاسی تگ و تاز کو دیکھیے۔ ایک بگولا نظر آئے گا، رقص کناں۔ ایک شعلہ دکھائی دے گا مستعجل۔ ایک کاروانِ بے منزل، ایک ناقۂ بے زمام۔ قدم اٹھ رہے ہیں لیکن منزل طے نہیں ہوتی کہ کسی کو معلوم نہیں منزلِ مقصود کونسی۔ جدوجہد ہو رہی ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر اس جدوجہد سے مقصود کیا ہے! پوری کی پوری قوم کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مردِ راہ داں کے لئے

کہ ۱۹۳۰ء میں، اس مردِ مومن نے جسے عمر بھر کے تدبر فی القرآن نے ایک خاص بصیرتِ قرآنی عطا فرما دی تھی اس منتشر قافلے کے افراد کو الٰہ آباد کے مقام پر جمع کیا اور انہیں بتایا کہ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں ان کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ یہ وہ نشانِ منزل تھا جس نے اس قوم کی آوارگیٔ فکر و نظر کو ختم کر کے ان کی توجہات کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا جو اس کے بعد ان کی سیاسی تگ و تاز کا محور بن گیا۔ یہی وہ مقصود تھا جو بالآخر پاکستان کی مشہود صورت میں ہمارے سامنے لباسِ مجاز میں نمودار ہو گیا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ خطبۂ صدارت جس میں انہوں نے پہلے پہل پاکستان کا تصور دیا تھا ہماری ملی تاریخ میں سنگِ میل کا مقام رکھتا ہے اور اس قابل ہے کہ اسے ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھا جائے۔ طلوعِ اسلام نے ۱۹۴۰ء میں، جبکہ اسی تصورِ پاکستان نے، اسی مردِ مومن کی قبر کے سرہانے (بمقام منٹو پارک، لاہور) مسلم لیگ کے ریزولیشن کی شکل اختیار کی تھی، اس خطبۂ صدارت کا اردو ترجمہ بتمام و کمال شائع کیا تھا۔ آج ہم اس خطبہ کے اہم مقامات کو (بہ ادنیٰ تغیرات لفظی) پھر شائع کر رہے ہیں کہ یہ بھولے ہوئے افسانے جتنی مرتبہ دہرائے جائیں کم ہیں۔ غور کیجئے کہ اس خطبۂ صدارت میں حقائقِ زندگی کس قدر درخشندگی و تابناکی سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں، کہ جو دانش برہانی قرآن کی دانشِ نورانی سے اکتسابِ ضیا کرتی ہے، اس کی چمک دمک کی یہی کیفیت ہو جایا کرتی ہے۔

طلوعِ اسلام)

نورِ بصیرت میں کسی جماعت کا لیڈر نہیں اور کسی لیڈر کا پیرو نہیں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام اور اس کی شریعت، اس کی سیاست مدن، اس کی ثقافت (کلچر)، اس کی تاریخ اور اس کے ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس روحِ اسلامی کے ساتھ جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوتی جاتی ہے، میری وابستگی نے مجھے ایک ایسی فراست عطا کر دی ہے جس کی روشنی میں میں اس عظیم الشان اہمیت کا اندازہ کر سکتا ہوں جو اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت ثابتہ کی حیثیت سے حاصل ہے۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس فراست کی روشنی میں جو مجھے حاصل ہے آپ کو اس اصل اساسی کا صحیح اور واضح احساس کر دوں جو (سیاسی) فیصلوں کی عمومی تشکیل کر سکے۔

اسلام اور قومیت اسلام جو ایک اخلاقی نصب العین اور ایک خاص قسم کی سیاست مدن کا مجموعہ ہے، مسلمانانِ ہند کی تاریخ حیات میں سب سے بڑا جزو ترکیبی رہا ہے۔ اس نے وہ اساسی جذبات اور باہمی کشش کے سامان مہیا کئے ہیں جو منتشر افراد اور مختلف گروہوں کو بتدریج متحد کر کے بالآخر انھیں ایک متمیز اور معین قوم کی صورت میں منظم کر دیتے ہیں جو اپنا مخصوص اخلاقی شعور رکھتی ہے۔ ہندوستان وہ ملک ہے جس میں اسلام کا وہ شعبہ جو قوموں کی تعمیر سے متعلق ہے اپنی پوری آب و تاب سے کارفرما ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظامِ ترکیبی نے سوسائٹی کی جو صورت اختیار کی وہ صرف اس امر کی رہینِ منت ہے کہ اسلام ایک ایسے کلچر کی حیثیت سے عمل پیرا ہوا ہے جس کا محرک ایک مخصوص اخلاقی تصور ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلم سوسائٹی نے اپنی نمایاں ہم آہنگی اور قلبی یک جہتی کے ساتھ جو موجودہ شکل اختیار کی ہے وہ ان آئین و قوانین کے قالب میں ڈھل کر تیار ہوئی ہے جن کا اسلامی کلچر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن وہ خیالات جو مفکرینِ یورپ نے دنیائے سیاست میں پھیلا دیئے ہیں وہ ہندی و غیر ہندی مسلمانوں کی موجودہ نسل کے مطمحِ نگاہ کو نہایت تیزی کے ساتھ بدلتے جا رہے ہیں۔ ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر اس امر کے لئے مضطرب ہو رہے ہیں کہ اپنے اپنے ملکوں میں ان خیالات کو عمل میں لے آئیں۔ وہ ان حقائق پر کبھی تنقیدی نگاہ نہیں ڈالتے جو یورپ میں ان خیالات کے ارتقا کا باعث ہوئے ہیں۔ یورپ میں مسیحیت تارک الدنیا اشخاص کا ایک نظام سمجھا جاتا تھا جس نے رفتہ رفتہ ایک وسیع نظام کلیسائی کی صورت اختیار کر لی۔ لوتھر نے جو صدائے احتجاج بلند کی تھی وہ اس کلیسائی نظام کے خلاف تھی نہ کہ دنیائے معاملات کے کسی نظامِ مدنیت کے خلاف، اس لئے کہ عیسائیت کو کسی ایسے سیاسی نظام سے تعلق ہی نہیں۔ بلاشبہ لوتھر اس نظام کے خلاف بغاوت کرنے میں بالکل حق بجانب تھا۔ مگر میرے نزدیک اس نے اس امر کا احساس نہ کیا تھا کہ یورپ کے مخصوص حالات میں اس بغاوت کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت مسیحؑ کا عالمگیر نظامِ اخلاق کالعدم و بالا ہو جائیگا، اور بے شمار قومی اور محدود نظام ہائے اخلاق اس کی جگہ لے لیں گے۔ روسو اور لوتھر جیسے آدمیوں کی اس قسم کی تحریکوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کر ایسی کثرت میں تبدیل ہو گئی جس کے مختلف اجزا میں کوئی باہمی ہم آہنگی نہ تھی اور انسانیت کا

ایک ہمہ گیر تصور قومیت کے تنگ دائرہ میں گھر کے رہ گیا۔ قومیت کا یہ تصور کسی محسوس بنیاد، مثلاً عقیدۂ وطنیت پر قائم ہوسکتا تھا اور اس کا اظہار ایسے مختلف نظام ہائے سیاست کے ذریعے سے ہی ممکن تھا جو قومی خطوط پر نشوونما حاصل کرسکتے ہوں، وہ خطوط جو صرف اس اصول کو ہی تسلیم کریں کہ سیاسی اتحاد کی بنیاد جغرافیائی حدود پر ہی قائم ہوسکتی ہے۔ اگر مذہب کے متعلق عقیدہ ہی یہ ہو کہ اس کا تعلق کا ملاً اگلے جہان سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل لازمی تھا حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اصول اخلاق کی جگہ قومیت کے نظریہ اخلاق و سیاست نے لے لی۔ اس تخریب و تعمیر اور رد و بدل کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ یہ سمجھ بیٹھا کہ مذہب ہر فرد کا نجی معاملہ ہے اور انسان کی دنیاوی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام وحدت انسانی کو روح اور مادہ کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا و کائنات، روح اور مادہ، مذہب اور سیاست میں ناخن اور گوشت کا سا باہمی تعلق ہے۔ اس کے نزدیک انسان کسی ایسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جسے کسی ایسی مقدس دنیا کے حصول کی خاطر تیاگ دینا پڑے، جو اس دنیا سے الگ کہیں اور واقع ہے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس صورت کا نام ہے جو زمان و مکان کے لباس مجاز میں جلوہ فرما ہے To Islam matter is spirit realising itself in space and time — یورپ نے مانی کے عقیدے سے روح اور مادہ کی ثنویت کا خیال اخذ کیا اور بلا تنقید اسے قبول کرلیا۔ آج یورپ کے بہترین مفکر تو اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں لیکن اس کے سیاسی مدبر غیر محسوس طور پر دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ وہ بند ھادھند اس غلطی کو ایک عقیدہ کی حیثیت سے قبول کرلے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ روح اور مادہ کی یہی وہ غلط تفریق ہے جو یورپ کے مذہبی اور سیاسی افکار پر اس نہج سے اثر انداز ہوئی ہے کہ اس نے یورپ کے نظام حکومت سے مسیحیت کو قریب قریب بالکل خارج کر دیا ہے، جس کی وجہ سے یورپ ایسی بے جوڑ سلطنتوں کا مجموعہ بن کے رہ گیا جس کے سر میں انسانیت کا سودا نہیں، بلکہ اس پر قومیت کا بھوت سوار ہے۔ یہی بے جوڑ اور منتشر سلطنتیں عیسائیت کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات کو پامال کرنے کے بعد اب ایک متحدہ یورپ کی ضرورت کا احساس کر رہی ہیں، یعنی پھر اسی وحدت کا احساس جسے مسیحی کلیسا کے نظام نے ابتدا میں ان کو دیا تھا۔ لیکن انھوں نے بجائے اس کے کہ حضرت مسیحؑ کے عالمگیر اخوت انسانی کے تصور کی روشنی میں اس کی تشکیل کرتے لوتھر کی تعلیم سے متاثر ہو کر تباہ و برباد کر ڈالا —

دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا تصور ہی ممکن نہیں، کیونکہ اسلام میں یورپ کے ازمنہ متوسط جیسا کوئی کلیسائی نظام ہی موجود نہیں جو اپنے کسی تباہ کرنے والے کو بلا رہا ہو۔ دنیائے اسلام میں ہمارے پاس ایک عالمگیر نظام سیاست موجود ہے۔ بنیادی اصولوں کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ان کا سرچشمہ علم الٰہی ہے۔ ان بنیادوں پر جو عمارت قائم ہے وہ البتہ ضروریات زمانہ کے مطابق ایک نئی روح کی محتاج ہے اور اس احتیاج کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے فقہاء (واضعین قوانین) دنیائے جدید کے واقعات سے متمتع نہیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دنیائے اسلام میں قومیت کے اس تصور کا انجام کیا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی کرنا مشکل ہے کہ آیا اسلام اس کو اپنے اندر جذب کرکے اس کی ترکیب کو بدل

دیگا' جیسا کہ یہ اس سے قبل بہت سے مختلف النوع خیالات کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی نوعیت کو بدل چکا ہے۔ یا خود اسلام اس نظریہ کی قوت سے متاثر ہو کر اپنے نظام کو یکسر تبدیل کرے گا۔ حال ہی میں مجھے لیڈن یونیورسٹی (ہالینڈ) کے پروفیسر وین سینک (Wen Sinck) نے لکھا تھا۔

> مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اس وقت اس نازک دور میں داخل ہو رہا ہے جو مسیحیت ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے طاری ہے۔ سب سے مشکل مسئلہ یہ ہے کہ وہ کونسا طریق عمل اختیار کیا جائے جس سے قدیم دقیانوسی غلط تصورات کی عمارت تو منہدم ہو جائے لیکن مذہب کی بنیادیں محفوظ رہیں۔

اسلام کا دور ابتلاء

اور موجودہ دور میں تو یہ ہو رہا ہے کہ قومیت کا تصور مسلمانوں کے مطمح نگاہ میں نسل پرستی کا جذبہ ابھار رہا ہے' اور ان مساعی حسنہ کو غارت کر رہا ہے جنہیں شرف انسانیت کی خاطر اسلام نے سرانجام دیا تھا۔ اور نسل پرستی کے اس شعور کا مطلب یہ ہے کہ نظام حیات کے متعلق ایسے نظریے اور معیار قائم ہو جائیں جو نہ صرف اسلامی نظریات زندگی سے مختلف ہوں بلکہ ان سے متصادم ہو جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات مجھے اس نیم علمی بحث سے معذور سمجھیں گے۔ آپ حضرات نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کیلئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اسلام ایک زندہ اور پائندہ قوت ہے۔ وہ نگہ انسانی کو جغرافیائی حدود و قیود کے قفس سے آزاد کر کے اسے اس کی فطری وسعتوں میں اذن بال کشائی دے گا۔ جس کا عقیدہ ہے کہ مذہب انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک اہم ترین طاقت کا حامل ہے' اور جس کا محکم یقین ہے کہ اسلام خود تقدیر الٰہی ہے۔ زمانہ کی تقدیریں اس کے ہاتھ میں رہیں گی اور اس کی تقدیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہوگی۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ تمام مسائل کو اپنے خاص زاویہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ ہرگز خیال نہ فرمایئے کہ جس مسئلہ کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ خالص نظری مسئلہ ہے۔ نہیں' یہ تو ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جو خود نفس اسلام پر بحیثیت ایک نظام حیات و عمل اثر انداز ہوگا۔ اس مسئلہ کے صحیح اور مناسب حل پر ہی اس امر کا انحصار ہے کہ آپ حضرات ہندوستان میں ایک ممتاز تہذیب کے علمبرداروں کی حیثیت سے زندہ رہ سکیں۔ ہماری تاریخ میں اسلام پر کبھی ابتلا و آزمائش کا ایسا زمانہ نہیں آیا جیسا آجکل اسے درپیش ہے۔ ہر قوم اس باب میں مختار ہے کہ اپنے اپنے معاشرتی نظام کے اصول اساسی میں ترمیم' تاویل یا تنسیخ کر لے۔ لیکن ایک تازہ تجربہ کرنے سے پہلے اس کے لئے قطعاً ضروری ہے کہ اپنے اس تجربہ کے نتائج و عواقب پر واضح انداز سے غور و خوض کر لے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کیا ہے اور اس کے ماللہ و ماعلیہ کیا ہیں؟ کیا مذہب سچ مچ ایک نجی معاملہ ہے؟ کیا آپ اس امر کو پسند فرمائیں گے کہ بحیثیت ایک اخلاقی اور سیاسی نظریہ کے اسلام کا بھی دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو جو اس سے پہلے عیسائیت کا یورپ میں ہو چکا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو ایک اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے تو باقی رکھیں' لیکن ایک نظام سیاست کی حیثیت سے اس کو رد کر کے اس کی جگہ وہ قومی

Nationalist نظام ہائے سیاست اختیار کر لیں جن میں مذہب کو کسی قسم کی دخل دہی کی اجازت نہ ہو؟ یہ سوال ہندوستان میں ایک خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ ایک یورپین کی زبان سے تعجب انگیز نہیں کہ مذہب ایک نجی اور انفرادی چیز ہے۔ یورپ میں عیسائیت کا تصور ایک کیش ربانیت کی حیثیت رکھتا تھا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ مادی دنیا کو ترک کر کے تمام توجہات صرف روحانی دنیا پر مرکوز کر دی جائیں۔ اس کیش کا منطقی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا جو مذکورہ بالا دعویٰ میں کیا گیا ہے (یعنی یہ کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے) لیکن نبی کریم صلعم کے واردات و کیفیات روحانی Religious experiences کی جو نوعیت قرآن مجید سے ظاہر ہوتی ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کیفیات و واردات اس قسم کے نہیں ہوتے کہ وہ محض شخص متعلقہ کے قلب میں پیدا ہو کر صرف اسی پر اثر انداز ہوں اور اس کا معاشرتی ماحول اس سے کچھ بھی متاثر نہ ہو۔ یہ ایسی کیفیات ہیں کہ ان کا ہبوط تو قلب انسانی ہو لیکن ان سے ایک پورا معاشرتی نظام وجود میں آجائے۔ ان کیفیات کا فوری حاصل یہ ہوتا ہے کہ ان سے ایک خاص نظام تمدن کے اصول اساسی مرتب ہو جاتے ہیں جو آئینی تصورات (قوانین و ضوابط) کا ایک جہانِ خاموش اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہیں اور جن کی تہذیبی اہمیت محض اس لئے کم نہیں ہو سکتی کہ ان کا ماخذ وحی الٰہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام میں مذہب اور اس کے پیدا کردہ معاشرتی نظام میں کچھ ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ اگر ایک کو رد کر دیا جائے تو دوسرا خود بخود رد ہو جاتا ہے۔ بنا بریں قومیت کے خطوط پر کسی ایسے نظام تمدن کی تعمیر جو وحدتِ اسلامی کے اصول سے متصادم ہوتا ہو، مسلمان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اسوقت براہ راست مسلمانانِ ہند کے درپیش ہے۔ رینان لکھتا ہے کہ "انسان نہ تو نسل اور نہ مذہب کا غلام بنایا جا سکتا ہے، اور نہ دریاؤں اور پہاڑوں کی حد بندیاں اسے مقید کر سکتی ہیں۔ بلکہ صحیح الدماغ اور گرمجوش دل رکھنے والے انسانوں کی عظیم الشان اجتماعیت ایک اخلاقی شعور پیدا کر دیتی ہے جسے "قوم" کہتے ہیں"۔ اس قسم کی جماعتی ترکیب ناممکن نہیں۔ اگرچہ اس کے لئے ایک طویل اور زہرہ گداز مرحلہ طے کرنا پڑے گا جس میں یوں کہئے کہ انسانوں کو نئے قالب میں ڈھالنا اور انہیں تازہ جذبات سے مسلح کرنا ہوگا۔ اگر ہندوستان میں کبیر کی تعلیم اور شہنشاہ اکبر کا دین الٰہی عوام کی ذہنیت پر غالب آجاتا تو اس قسم کی قومیت اس ملک میں بھی قائم ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف ذاتوں اور اس کے مختلف مذہبی گروہوں میں یہ رجحان کبھی پیدا نہیں ہوگا کہ وہ اپنی انفرادی جزئیات کو ایک عظیم الشان "کل" میں فنا کر دیں۔ ہر گروہ اپنی جماعتی ہستی قائم رکھنے کے لئے بضد ہے۔ اس قسم کے اخلاقی شعور کا پیدا ہونا جو رینان کے نظریہ قومیت کا اصل اصول ہے اتنی بڑی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے کہ اقوامِ ہند اسے ادا کرنے کے لئے بالکل آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا ہندوستان میں اتحاد قومی یہاں کی مختلف اقوام کے جداگانہ وجود کے انکار میں نہیں بلکہ ان سب کے تعاون اور ہم آہنگی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ہندوستان بجائے خود ایک چھوٹا سا ایشیا ہے۔ اس کے باشندوں کے ایک حصہ کا کچھ اقوامِ مشرق کے کچھ سے ہم آہنگ ہے اور دوسرے حصہ کا کچھ وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے کچھ کے ساتھ۔ اگر ہندوستان میں باہمی اشتراکِ عمل کا

کوئی موثر اصول دریافت کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری ناقابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ تر کارگہ تاریخ میں اپنے محل وقوع کی وجہ سے مدت دراز تک مصیبت و ابتلا کی آماجگاہ رہی ہے، امن وامان اور مصالحت باہمی کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگیں گی اور اس کے ساتھ ہی ایشیا بھر کی تمام سیاسی گتھیاں بھی سلجھ جائیں گی۔

لیکن اس تلخ حقیقت کے بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی اندرونی یک جہتی کے لئے اس قسم کے اصول دریافت کرنے میں جتنی کوششیں کیں وہ اب تک بالکل ناکام رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کوششیں کیوں ناکام رہی ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ایک دوسرے کی نیتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور دلوں میں یہ آرزوئیں چھپی ہوتی ہیں کہ کسی نہ کسی طرح فریق مقابل پر تغلب اور تسلط حاصل کر لیا جائے۔ یا اس کی یہ وجہ ہے کہ باہمی اشتراک عمل کے بلند مقاصد تباہ ہوتے ہوں تو ہوں لیکن وہ استمراری اجارہ داری ہاتھ سے نہ جانے پائے جو اتفاقات زمانہ سے ایک فریق کے قبضہ میں آچکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ دماغ میں انا ولا غیری کا سودا سمارہا ہے لیکن ان جذبات کو قومیت پرستی کے مقدس جبے میں چھپایا جا رہا ہے۔ بلند بانگ دعاوی کو دیکھو تو حب الوطنی کی وسعت قلبی کے مظاہرے ہو رہے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں میں اتر کر جائزہ لو تو وہاں "ذات" اور "قبیلہ" کی وہی پرانی تنگ نظری جلوہ فرما ہے۔ ہاں! اور اس کا یہ بھی باعث ہو سکتا ہے کہ اس حقیقت کے تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ اس ملک میں ہر ایک جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تمدنی روایات کے مطابق آزادانہ طور پر اپنی جماعتی نشوونما کر سکے۔ بہرحال ہماری ناکامی کی وجوہ کچھ بھی ہوں میں اب تک مایوس نہیں ہوں۔ واقعات کی رفتار ایک اندرونی یک جہتی کے میلان کا پتہ دیتی ہے، اگر اس اصول کو ایک مستقل فرقہ وارانہ تصفیہ کا سنگ بنیاد تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنے اس وطن عزیز میں اس امر کی مکمل آزادی حاصل ہوگی کہ وہ اپنے کلچر اور روایات کی بنا پر ہی اپنی نشوونما کر سکتے ہیں تو جہاں تک میں نے مسلم ذہنیت کا مطالعہ کیا ہے میں بلا تامل اعلان کرتا ہوں کہ اس اصول کے تسلیم کر لینے کے بعد مسلمان ہندوستان کی آزادی کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے پر بالکل آمادہ ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ اصول کہ ہر جماعت کو اپنی مخصوص بنیادوں پر آزادانہ نشوو ارتقا کا حق حاصل ہونا چاہئے، کسی تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبہ پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی بھی کئی قسم کی ہے اور اس کے اقسام میں بین فرق پایا جاتا ہے۔ جو قوم دوسری قوموں کے متعلق اپنے دل میں بدخواہی کے جذبات کی پرورش کرتی ہے وہ نہایت پست فطرت اور رذیل قوم ہے۔ میرے دل میں دوسری قوموں کے رسوم و شعائر قوانین و ضوابط اور مذہبی اور معاشرتی ادارت کا بے حد احترام ہے۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھئے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق تو مجھ پر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں دوسری قوموں کے معابد کی حفاظت بھی کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس ملت سے عشق ہے جو میری زندگی کی طبعی افتاد کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے مذہب، اپنے لٹریچر، اپنی حکمت اور اپنے کلچر کی تجلیات سے اقبال کو اقبال بنا دیا ہے، اور یوں اپنے درخشندہ ماضی کو ایک جیتے جاگتے زندگی بخش عنصر کی صورت میں میرے حال میں سمو دیا ہے۔

ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان

ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل کی تشکیل کے لئے بلند سطح کی فرقہ پرستی بالکل ضروری اور ناگزیر ہے۔

برعکس یورپی ممالک کے ہندوستان میں جماعتی تشکیل کی بنا جغرافیائی حدود نہیں۔ ہندوستان ایک ایسا برِ اعظم ہے جس میں مختلف النسل، مختلف اللسان اور مختلف المذاہب انسانوں کی جماعتیں آباد ہیں۔ ان کے نظریات زندگی کی بنا کسی مشترک نسلی شعور پر نہیں۔ حتیٰ کہ ہندو بھی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جس کے مختلف افراد میں فکر و نظر کی یکسانیت ہو۔ ہندوستان میں یورپی اصولوں کے مطابق جمہوریت کی تشکیل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہاں مختلف فرقوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ بالکل حق بجانب ہے کہ ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان کو معرضِ وجود میں لایا جائے۔

دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے، میرے نزدیک تو اس کا محرک بھی مقدس جذبہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہندوستان میں مختلف جماعتوں کے جذبہ آزادی کا گلا گھونٹ دیا جائے انہیں اس امر میں خود مختار چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے اپنے حلقہ میں اپنے مخصوص نظریات زندگی کے ماتحت اپنے جوہرِ مقصد کی نشوونما کر سکیں، اور پھر ان جمیع عناصر کے مجموعہ سے ایک ہم آہنگ کل تشکیل ہو۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں تو ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد ریاست قائم کی جائے۔ (ہندوستان کو) حکومت خود اختیاری زیرِ سایہ برطانیہ ملے یا اس سے باہر۔ کچھ بھی ہو، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام کم از کم اس علاقہ کے مسلمانوں کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ بلحاظ آبادی مجوزہ ریاست ہندوستان کے بعض موجودہ صوبوں سے بھی چھوٹی ہوگی۔ اگر قسمت انبالہ اور چند ایسے اضلاع کو جن میں غیر مسلم آبادی کی اکثریت ہے اس ریاست سے خارج کر دیا جائے تو یہ رقبہ میں کم ہو جائیگی اور اس میں مسلمانوں کا تناسب آبادی بڑھ جائے گا۔ جب اس طرح غیر مسلم آبادی کا تناسب بہت کم رہ جائے گا تو یہ متحدہ اسلامی ریاست اس قابل ہو جائے گی کہ وہ اپنے علاقہ کے اندر رہنے والی اقلیتوں کو موثر تحفظات دے سکے۔ اس تجویز سے نہ تو ہندوؤں کو بدکنا چاہئے اور نہ انگریز کو ہی پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک مخصوص علاقہ میں مرکوز کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند کے اس زندہ اور جاندار طبقہ کی کہ جس کے بل بوتے پر یہاں برطانوی راج قائم ہے (باوجودیکہ برطانیہ نے ان سے کبھی منصفانہ برتاؤ نہیں کیا) اگر یوں ایک مرکزیت قائم کر دی جائے تو یہ آخر الامر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ایشیا کی گتھیاں سلجھا دے گا۔ اس سے مسلمانوں میں ذمہ داری کا احساس اور ان کا جذبۂ حب وطن اور بھی زیادہ ہو جائیگا۔ جب اس طرح شمال مغرب کے مسلمانوں کو ہندوستان کے سیاسی نظام میں رہتے ہوئے بڑھنے پھولنے کے مواقع حاصل ہوں گے تو وہ بیرونی حملے کے مقابلہ میں خواہ وہ خیالات کا سیلاب ہو، یا شمشیر و سنان کا ہجوم،

ہندوستان کی بہترین مدافعت کر سکیں گے۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمان شمال مغربی سرحد کے قریب آزاد اسلامی ریاستوں کا مطالبہ اس لئے کر رہے ہیں کہ بوقت ضرورت حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کا ایک ذریعہ ان کے ہاتھ آجائے۔ میں مسٹر شاستری کو کھلے کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کا محرک وہ جذبہ نہیں ہے جس کا الزام وہ مسلمانوں پر عائد کر رہے ہیں۔ یہ مطالبہ مسلمانوں کی اس دلی خواہش پر مبنی ہے کہ انھیں بھی کہیں اپنی نشوونما کا موقع ملے۔ اس سے اس قسم کے مواقع کا حاصل ہونا اس وحدت قومی کے نظامِ حکومت میں قریب قریب ناممکن ہے جس کا نقشہ ہندو ارباب سیاست اپنے ذہن میں لئے بیٹھے ہیں اور جس سے مقصود جیسا یہ ہے کہ تمام ملک میں مستقل طور پر انھیں کا غلبہ اور تسلط ہو۔

مذہبی حکومت ہندوؤں کو یہ خطرہ بھی لاحق نہیں ہونا چاہئے کہ آزاد مسلمان ریاستوں کے قیام سے مقصد یہ ہوگا کہ ان میں ایک قسم کے مذہبی نظامِ حکومت کی ترویج ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے متعلق جب "مذہب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مفہوم کیا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا ہی نام نہیں ہے۔ یہ ایک نظامِ حکومت ہے جس کی ہیئت ترکیبی میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر عملِ خیر کو اپنے اندر جذب کرلے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دماغ میں ایسے نظام کا خیال تک بھی نہ آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان جمادات اور نباتات کی طرح پابگل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطہ زمین سے منسوب کرے کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک روحانی ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ پر فٹ ہو۔ وہ اس مشین کا ایک فعال پرزہ ہوتا ہے اور اسے ٹھیک انداز میں چلانے کے لئے اس پر حقوق و فرائض کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

لہٰذا ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے متعلق میرا مطالبہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہندوستان دونوں کے بہترین مفاد پر مبنی ہے۔ اس سے چونکہ اندرونی طاقتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا اس لئے ملک میں امن و امان قائم ہو جائے گا۔ یہ تو ہندوستان کو فائدہ ہوگا۔ اور اسلام کو موقع ملے گا کہ اس پر غربی ملوکیت سے جو غیر اسلامی اثرات غالب آچکے ہیں ان سے مخلصی حاصل کرلے اور اپنے شرعی قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی کلچر کی تنظیم کر کے انھیں اپنی اصلی روح اور عصرِ حاضر کی ضروریات سے قریب تر لا سکے۔

فیڈریشن چونکہ ہندوستان میں آب و ہوا، نسل، زبان، معتقدات اور معاشرتی نظام میں گوناگوں اختلافات ہیں، اس لئے یہاں کسی محکم دستوری نظام کے لئے صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں زبان، نسل، تاریخ، مذہب کی وحدت اور اقتصادی مفاد کی یکسانیت کی بنیادوں پر خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں۔ سائمن رپورٹ کے تصورِ کی فیڈرل (مرکزی) مجلس واضع قوانین انتخاب عام سے

مرتب نہیں ہوگی بلکہ وہ فیڈرل ریاستوں کے مختلف نمائندوں کی مجلس ہوگی۔ سائمن رپورٹ میں یہ چیز بھی موجود ہے کہ ملک کو مختلف علاقوں میں نئے سرے سے اسی اصول پر تقسیم کیا جائے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر صحیح طریق پر صوبوں کی جدید تقسیم عمل میں آگئی تو ہندوستان کے آئینی مباحث میں سے جداگانہ اور مخلوط حلقہ ہائے انتخاب کا مسئلہ خود بخود معدوم ہو جائے گا، کیونکہ صوبجات کی موجودہ ترکیب ہی موجودہ مناقشات کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ ہندو کا خیال ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا اصول حقیقی قومیت پرستی کے منافی ہے۔ قومیت کا جو تصور اس نے قائم کر رکھا ہے اس سے مفہوم یہ ہے کہ مختلف جماعتیں اور فرقے یوں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں کہ کسی انفرادی تشخص باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حالات موجود نہیں، اور نہ اس کا ہونا مناسب ہے۔ ہندوستان مختلف النسل اور مختلف المذاہب انسانوں کا ملک ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام اقتصادی پستی، تمام ہندوستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص ان کا لاتعداد قرضہ، صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریت جو کسی وقت اقلیت میں بدلی جا سکتی ہے۔ ان امور کے پیش نظر واضح ہو جاتا ہے کہ ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے لئے اس قدر مضطرب کیوں ہیں۔

ہندوستانی اور انگلستانی "پنڈت"

ہندوستانی پنڈت (نہرو رپورٹ) مرکز کو بحالت موجودہ قائم رکھنا چاہتے ہیں، یعنی وہ فیڈریشن کے بجائے وحدانی Unitary طرز حکومت اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں تمام صوبے مرکز کے ماتحت رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مرکزی اسمبلی میں ان کی اکثریت مضبوط اور مستحکم ہو جائے گی۔ برعکس اس کے انگلستانی پنڈت یہ محسوس کرتے ہیں کہ مرکز کی جمہوریت ان کے مفاد کے خلاف جائے گی۔ اور اگر ذمہ دار حکومت کے حصول کے لئے ایک بھی قدم آگے بڑھا تو جو اختیارات آج ان کے ہاتھ میں ہیں وہ بھی ان سے چھن جائیں گے۔ اس لئے وہ جمہوری نظام کو مرکز کی بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دینے کی فکر میں ہیں۔ لیکن جن مقاصد کے پیش نظر وہ فیڈریشن کے اصول کی قدر و قیمت متعین کر رہے ہیں وہ ان مقاصد سے مختلف ہیں جن کے ماتحت ہندوستان کے مسلمان اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ مسلمان فیڈریشن کا مطالبہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے ذریعہ سے ہندوستان کا مشکل ترین عقدہ یعنی فرقہ وار مسئلہ حل ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے جو صورت حالات پیدا ہوگی، برطانیہ اس سے بچاؤ کی کوئی شکل نکالنا چاہتا ہے۔ اسے فرقہ وار مسئلہ کے حل کی کوئی فکر نہیں۔ نہرو رپورٹ کے واضعین اس چیز کو بھانپ کر کہ مرکزی اسمبلی میں اکثریت ہندوؤں کو حاصل ہوگی وحدانی نظام حکومت کی تجویز پر قائم ہو گئے ہیں۔ سائمن رپورٹ برائے نام فیڈریشن کے چلمنی پردہ کی آڑ میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اہل برطانیہ قدرتی طور پر اس اقتدار سے دستکش ہونا نہیں چاہتے جو انہیں آج تک حاصل رہا ہے۔ نیز ہندوستان کی مختلف اقوام میں باہمی سمجھوتہ نہ ہو سکنے کی صورت میں اہل برطانیہ کو بہانہ مل جاتا ہے کہ موجودہ طاقت اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں۔ جہاں تک وحدانی نظام حکومت کا تعلق ہے وہ تو میرے نزدیک آزاد

ہندوستان میں قابل التفات ہی نہیں۔

میں مسلمانوں کو کبھی کسی ایسے نظام کے قبول کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا کہ جس میں حقیقی فیڈریشن کا اصول مفقود ہو، یا جس میں مسلمانوں کی انفرادی ملی ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے، خواہ وہ نظام برطانوی الاصل ہو خواہ ہندی الاصل۔

گول میز کانفرنس میں والیان ریاست نے دفعۃً آل انڈیا فیڈریشن میں شرکت کا اظہار کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندو مندوبین کا جواب تک وحدانی طرز حکومت کے بالکل برعکس لزل حامی چلے آتے تھے، خاموشی سے فیڈرل سکیم پر اظہار رضامندی تعجب انگیز تھا۔ لیکن بالفاظ دیگر اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی امپریلزم اور ہندو انڈیا میں ایک ایسا سودا ہو جائے جس کی رو سے ہندو ہندوستان میں انگریز کے وجود کو دائمی بنا دیں اور انگریز اس کے صلہ میں ہندوستان میں ہندوؤں کو ایک ایسا نظام حکومت عطا کر دیں جس میں تمام دیگر اقوام ہندوؤں کی مستقل غلامی کے پھندے میں جکڑی رہیں۔ انگریز اپنے خاص شاطرانہ انداز سے ایسی چال چلنا چاہتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے کچھ نہ جائے اور ہر ایک کو خوش بھی کر دیا جائے، یعنی مسلمان کو فیڈریشن کے لفظی کھلونے سے ہندو کو مرکز میں اکثریت سے اور برطانوی ملوکیت کو حقیقی اختیارات کی تفویض سے۔

مسلمانوں کو انتباہ اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ کسی ایسی سکیم کو منظور کر لیا تو وہ یاد رکھیں کہ اس طرح وہ اپنی جداگانہ ملی ہستی کی قبر اپنے ہاتھوں سے کھود ڈالیں گے۔ مسلمانوں کو اس سے اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جب تک انھیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں مکمل اختیارات (یعنی اختیارات مابقی Residual powers بھی فیڈریشن کی بجائے صوبوں کو حاصل ہوں) کے ساتھ اکثریت نہ ہو جائے۔ نیز فیڈرل اسمبلی کے ارکان کی مجموعی تعداد میں سے ایک تہائی نشستیں نہ مل جائیں۔ فیڈریشن میں شامل ہونے والی مسلم ریاستوں کی نمائندگی کو اس ایک تہائی سے علیحدہ رکھا جائے۔

مسلمانانِ ہند کسی ایسے آئینی تغیر پر رضامند نہیں ہو سکتے جو جداگانہ انتخاب اور پنجاب اور بنگال میں ان کے حقوق اکثریت پر اثر انداز ہو یا اس امر کی ضمانت نہ دے کہ مرکزی مجلس واضع قوانین میں ان کی نیابت ایک تہائی یقینی طور پر ہو گی۔ مسلمانوں کے سیاسی راہنما اس سے پہلے دو موقعوں پر غلطی کھا چکے ہیں۔ اول میثاقِ لکھنؤ، جس کی تخلیق ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کے غلط نظریہ کے ماتحت کی گئی اور جس کی رو سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی اقتدار کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے۔ دوسرے وہ کوتاہ نگہی جو پنجاب کے مسلمانوں کی دیہاتی اور شہری تقسیم کا موجب بنی اور جس کی وجہ سے مسلمانوں کی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور یوں پنجاب کی اکثریت اقلیت میں بدل گئی۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانانِ پنجاب اور بنگال کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش نہ کر کے مسلمانوں کے ساتھ سخت بے انصافی کی ہے اور مسلمانوں کے لئے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں چھوڑا کہ وہ یا تو میثاقِ لکھنؤ

قانع رہیں یا مخلوط انتخاب منظور کریں۔ حکومت ہند نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ رپورٹ شائع ہونے کے وقت سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں نے ان تجاویز میں کسی ایک کے قبول کرنے کے متعلق بھی رضامندی کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ باوجودیکہ حکومت ہند مسلمانوں کی شکایات کو حق بجانب تسلیم کرتی ہے، پھر بھی اس کو یہ ہمت کیوں نہیں پڑتی کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آئینی اکثریت دینے کی سفارش کرے۔

صوبجات سندھ و سرحد

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسے نظام پر رضامند نہیں ہو سکتے جس میں سندھ کو ایک مستقل صوبہ نہ بنایا جائے اور صوبہ سرحد کی سیاسی حیثیت دوسرے صوبوں کے برابر نہ کر دی جائے۔ سندھ اور احاطہ بمبئی میں تو کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی۔ خود ارکانِ کمیشن اعتراف کرتے ہیں کہ طریق بود و ماند اور تمدن کے اعتبار سے سندھ ہندوستان کی بجائے عرب اور عراق سے زیادہ قریب ہے۔ مشہور مسلم جغرافیہ دان مسعودی نے اس حقیقت کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ "سندھ ایک ایسا ملک ہے جسے ہندوستان کی بجائے ممالک اسلامیہ سے زیادہ قرب حاصل ہے"۔ سندھ کی پشت ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسطِ ایشیا کی طرف۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ علیحدگی سندھ کے راستہ میں مالی مشکلات حائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق آج تک میرے سامنے کوئی قطعی اور مستند بیان نہیں آیا۔ لیکن اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ واقعی اس قسم کی مشکلات موجود ہیں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حکومتِ ہند ایک ہونہار صوبہ کو مستقل نشوونما کی جدوجہد میں عارضی طور پر مالی امداد دینے کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتی۔

صوبہ سرحد کے متعلق یہ دیکھ کر بے حد قلق ہوتا ہے کہ ارکانِ کمیشن نے اس امر سے انکار ہی کر دیا ہے کہ اس صوبہ کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا کوئی حق حاصل ہے۔ افغان کے سگریٹ سلگانے کا فطری حق محض اس لئے چھین لیا جاتا ہے کہ وہ بارود خانہ میں مقیم ہے۔ یہ تمثیلی استدلال بظاہر کتنا ہی خوش آئند کیوں نہ ہو، ہے بہرحال ناقابل اطمینان۔ سیاسی اصلاحات کو روشنی کہنا چاہئے نہ کہ آگ۔ اور روشنی کا حق دار ہر انسان ہے خواہ وہ بارود خانہ کے اندر مقیم ہو خواہ کوئلہ کی کان میں۔ افغان بہادر ہے، بالغ نظر ہے اور اپنے جائز حقوق کے لئے تکلیف برداشت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس لئے اسے کامل خود اختیاری حکومت کے موانع سے محروم کرنے کی جو کوشش کی جائیگی وہ یقیناً برافروختگی کا باعث ہوگی۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کے مفاد کا تقاضا یہی ہے کہ اس قوم کو مطمئن رکھا جائے۔

گول میز کانفرنس

ذاتی طور پر گول میز کانفرنس کے نتائج سے متعلق میری توقعات کچھ زیادہ خوش آئند نہیں ہیں۔ امید تو تھی کہ فرقہ وارانہ مناقشات کی کشمکش گاہ سے دور نئی فضا زیادہ بصیرت افروز ہوگی لیکن لندن میں فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق جو بحث و تمحیص ہوئی اس سے یہ حقیقت کہ ہندوستان میں کی ان دو بڑی تہذیبوں کی حامل اقوام میں کس قدر اصولی اختلافات موجود ہیں اس انداز سے عریاں ہو گئی کہ اس سے پیشتر شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو۔ اس کے باوجود وزیر اعظم انگلستان اس حقیقت کو تسلیم کرنے کر

گریزاں ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ وزیرِ اعظم نے یہ کہتے ہوئے کہ پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کرنا اس کے لئے مشکل ہے کیونکہ مخلوط انتخاب کے اصول کو برطانیہ کے خیالات جمہوریت کے ساتھ زیادہ مطابقت حاصل ہے، یہ سوچا ہی نہیں کہ ایک ایسی سرزمین میں جہاں مختلف قومیں آباد ہوں برطانوی جمہوریت کے نمونہ پر کوئی نظامِ حکومت قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے لئے نظامِ حکومت کی بنیادیں متحدہ قومیت کے غلط تصور پر رکھنا یا یہاں ان اصولوں کو ٹھونسنا جو برطانیہ کے اندازِ جمہوریت کے راہنما ہوں، ہندوستان سے دوستی نہیں بلکہ اسے نادانستہ خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میری بصیرت کام دیتی ہے اس ملک میں اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان میں بسنے والی اقوام کو ایسے مواقع بہم نہ پہنچائے جائیں کہ وہ اپنے ماضی کے شجرِ مقدس سے پیوستہ رہتے ہوئے عصرِ حاضر کے داعیات کے مطابق خود مختارانہ اپنی ملت کی نشوونما کر سکیں۔

قومیتِ مسلمہ

اس وقت سر دھڑ کی بازی لگ رہی ہے، ہم تعداد میں بھی سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کی کوئی دوسری قوم ایسی نہیں جو ہماری طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ بلکہ ہندوستان کی تمام اقوام میں صرف مسلمان ہی ایک ایسی قوم ہے جس پر صحیح معنوں میں موجودہ زمانے کے مفہوم کے مطابق لفظ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو ہم سے ہر اعتبار سے آگے بڑھے ہوئے ہیں لیکن ان میں آج تک وہ ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکی جو منتشر افراد کو ایک قومیت کے رشتہ میں منسلک کرنے کے لئے لابدی ہے اور جو آپ کو اسلام کی بارگاہ سے بلا مزد و قیمت بطور عطیہ کے مل گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آج ہندو ایک قوم بننے کے لئے بے حد مضطرب اور بیتاب ہیں، لیکن افراد کو قوم بننے کے لئے ایسے دشوار گذار مراحل طے کرنے پڑتے ہیں جیسے قطرے کو گوہر بننے کے لئے۔ اور ہندو تو اس وقت تک ایک قوم بن ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ اپنے تمام موجودہ معاشرتی نظام کو یکسر بدل نہ ڈالیں۔

مسلمان لیڈروں اور سیاست دانوں کو اس قسم کے عیارانہ اور گمراہ کن استدلال کی رو میں نہیں بہہ جانا چاہیے کہ ترکی اور ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ کے باشندے قومی یعنی جغرافیائی نظریات کے تحت ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات مختلف ہیں۔ ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک میں قریب قریب تمام آبادی مسلمانوں کی ہے اور وہاں کی اقلیتیں بہ اصطلاح قرآن کریم "اہل کتاب" پر مشتمل ہیں اور اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاشرتی حد بندی نہیں ہے۔

اگر ہمارے یہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو پھر قوم کے لئے موت اور حیات کا سوال درپیش ہوگا۔ اس وقت مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر متحدہ طور پر عمل قدم اٹھائیں۔ اکابر ملت سیاسی معاملات کے متعلق کافی غور و فکر کر چکے ہیں جس نے ہمارے دلوں میں ان قوتوں کا کم و بیش احساس ضرور پیدا کر دیا ہے جو اس وقت ہندوستان کے اندر اور باہر کی قوموں کو تقدیر کے سانچے میں ڈھال رہی ہیں۔ لیکن میں دیانت

کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہوں نے ہمیں اس عملی اقدام کے لئے بھی تیار کر دیا ہے جس کے لئے مستقبل میں رونما ہونے والے حالات متقاضی ہوں گے۔ میں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ دور حاضرہ میں مسلمان دو مصیبتوں میں مبتلا ہیں پہلی مصیبت قحط الرجال کی ہے۔ مسلم قوم میں راہنماؤں کا فقدان ہے۔ لیڈروں سے میری مراد ایسے حضرات ہیں جنہیں مبدا فیض کی کرم گستریوں یا مشاہدات و تجربات کی بنا پر ایک طرف اسلام کی روح اور اس کی منتہائے نگاہ کے متعلق بصیرت تامہ حاصل ہو اور دوسری طرف عصر حاضر کے تاریخی خواہر بھی ان کی نگاہوں کے سامنے بے نقاب ہوں۔ ایسے لوگ درحقیقت وہ زندہ قوتیں ہوتے ہیں جو قوم کے عروق مردہ میں زندگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ وہ اللہ کی دین ہوتے ہیں۔ جسے چاہے دے۔ حسب فرمائش بنوائے نہیں جا سکتے۔

دوسری مصیبت جو مسلمانوں کو تباہ کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے دل سے احساس اجتماعیت فنا ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ افراد اور چھوٹے چھوٹے فرقے الگ الگ راستوں پر گامزن ہو رہے ہیں اور ان کا کوئی کام ملت کے اجتماعی افکار و اعمال کو کچھ فائدہ نہیں پہنچاتا۔ ہم آج سیاست میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو صدیوں تک مذہب کے دائرے میں کرتے رہے ہیں۔ لیکن (مذہبی) فرقہ بندی کے فروعی جھگڑے ہماری اجتماعیت کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ کوئی گروہ یا فرقہ اس حد تک سرکش نہیں ہو سکتا کہ وہ مسلمانوں کی جماعت سے کٹ جائے لیکن سیاسیات میں انتشار اور بالخصوص ایسے مواقع پر انتشار جبکہ قوم کی زندگی کا انحصار ہی اتحاد عمل پر ہو قوم کو فنا کر کے رکھ دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہم ان ہر دو مصیبتوں کا علاج کیا کریں۔ پہلی مصیبت (یعنی صحیح راہنماؤں کا فقدان) کا علاج تو ہمارے بس میں نہیں۔ البتہ دوسری مصیبت (عدم احساس اجتماعیت) میرے خیال میں ناقابل علاج نہیں۔ اس باب میں میرے سامنے ایک منظم لائحہ عمل موجود ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک وہ مزعومہ خطرہ پیدا نہ ہو جائے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا تذکرہ صرف اس لئے کر دیا ہے کہ آپ اسے پیش نظر رکھیں اور اس دوران میں اس پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں۔

خاتمہ سخن حضرات! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ خاتمہ پر میں اس امر کی اہمیت واضح کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں پر جو نازک وقت آ چکا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اندر وحدت افکار و عمل پیدا کر کے مکمل طور پر منظم ہو جائیں۔ ان کی یہ تنظیم ملت اسلامیہ اور ہندوستان دونوں کیلئے مفید ہوگی۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی ایشیا بھر کے لئے لاتناہی مصائب کا سرچشمہ بن رہی ہے۔ اس غلامی نے مشرق کی روح کو کچل دیا ہے۔ جس سرزمین کے ساتھ ہمارا جینا اور مرنا وابستہ ہو چکا ہے اس کی طرف سے ہم پر ایک اہم فریضہ عائد ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہم پر ایشیا کی طرف سے اور علی الخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ تنہا ایک ملک میں سات کروڑ فرزندان توحید کی جماعت کوئی معمولی چیز نہیں۔ تمام مسلم ایشیا کے ممالک مجموعی طور پر بھی اسلام کے لئے اتنی گراں بہا متاع نہیں جتنی اکیلے ہندوستان کی ملت اسلامیہ۔ اس لئے ہمیں ہندوستان کے مسئلہ کو صرف اس زاویہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا، بلکہ اپنی اہمیت کو محسوس

کرتے ہوئے اس نقطہ خیال سے بھی کہ ہماری موت وحیات کا عالم اسلامی پر کیا اثر ہوگا۔ ہندوستان اور ایشیا کی طرف سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان سے ہم کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، جب تک کہ ہمارا نصب العین متعین نہ ہو اور اس کے حصول کے لئے ہم سب منظم طور پر عزم نہ کر لیں۔ ہندوستان کے دیگر سیاسی گروہوں میں ہماری مستقل ملی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم منظم ہوں، متحد ہوں، ہم آہنگ ہوں۔ ہمارا بکھرا ہوا شیرازہ ان تمام سیاسی مسائل پر جن کے ساتھ ہماری ملت کی موت اور زندگی وابستہ ہے بہت بری طرح اثر انداز ہو چکا ہے۔ میں فرقہ وار مسائل میں سمجھوتہ کی طرف سے ناامید نہیں ہوں، لیکن مجھے تو کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں ہندوستان میں شاید ایسے خطرناک حالات پیدا ہو جائیں کہ مسلمان کو اپنا جداگانہ محاذ قائم کر کے ان کا مقابلہ کرنا پڑے اور ایسے خطرناک حالات میں آزاد راہِ عمل وہی قومیں اختیار کر سکتی ہیں جو حصولِ مقاصد کیلئے تلی بیٹھی ہوں اور اپنے تمام عزائم کو نقطۂ نصب العین پر مرکوز کئے ہوئے ہوں۔

کیا اس بات کے امکانات موجود ہیں کہ مسلمانوں میں وحدت افکار پیدا ہو سکے؟ ہاں یہ ممکن ہے۔ اس کیلئے طریق عمل یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو پارٹی بازی کے محدود مفاد اور ذاتی اغراض کی سطح سے بلند کر لیں اور اس بلند ترین نصب العین کی روشنی میں جس کی نیابت کے لئے دنیا میں ملت اسلامیہ کا وجود قائم ہے اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت متعین کریں، خواہ وہ اعمال مادی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر ہی کیوں نہ ہوں۔ اس مادیت کے کثیف مقاصد کو روحانیت کی لطیف منازل کی طرف گامزن ہو جایئے۔ مادہ انتشار کا مظہر ہے اور روح نورانیت، زندگی اور وحدانیت کی قندیل۔ مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے اور وہ یہ کہ ان کی تاریخ کے نازک ترین ادوار میں مذہب (اسلام) نے ملت کو بچایا ہے نہ کہ ملت نے مذہب کو۔ اگر آج آپ اپنے تمام تصورات اور تخیلات کو صرف اسلام کے نقطۂ اسکہ پر مرکوز کر دیں اور جو زندہ اور پائندہ اور قائم و دائم نظریۂ حیات وہ پیش کرتا ہے اس سے اپنی بصیرت حاصل کریں تو اس سے آپ اپنی منتشر قوتوں کو پھر سے مجتمع اور گم گشتہ مرکزیت کو از سرِ نو حاصل کر لیں گے۔ قرآن کریم کی ایک مہتم بالشان آیت (ما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ) میں بتایا گیا ہے کہ تمام نوع انسانی کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ ایک فرد واحد کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کے مثل ہوتی ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات جو بحیثیت قوم نوع انسانی کے متعلق اس بلند ترین تصور کے اولین مظہر ہونے کے جائز مدعی ہو سکتے ہیں باہمی بے تعلقی کو چھوڑ کر ایک جسدِ واحد کی طرح ایسی زندگی بسر نہ کریں (کہ اگر پاؤں کے انگوٹھے میں کانٹا چبھے تو آنکھ کے آبگینہ میں آنسو چھلک آئے)۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان میں معاملات جس طرح بظاہر نظر آتے ہیں ان کی حقیقت اس سے کہیں مختلف ہے تو میں آپ کو کسی جہستان میں الجھانا نہیں چاہتا۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم آپ کے افقِ دماغی پر اس وقت نور افشاں ہوگا جس وقت آپ انھیں حقیقی اجتماعی خودی کی روشنی میں دیکھنے کا ملکہ حاصل کر لیں گے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اھتدیتم

(اپنی خودی کا استحکام کرو۔ اگر تم صحیح راستہ پر گامزن ہو گے تو کوئی غلط راستے پر چلنے والا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا)

اقبالؒ اور قرآن

پرویز

تمہید باوجودیکہ قرآن کریم میں باعتبارِ بلاغت ہر وہ حسن موجود ہے جو ایک بہترین شعر میں ہونا چاہیئے، متعدد مقامات پر اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن کریم شاعری نہیں۔ رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں:۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۙ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۳۶/۶۹-۷۰)

اور ہم نے اس (رسول) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ اس کے شایانِ شان تھی بلکہ یہ تو ایک (فطرت کے بھلائے ہوئے سبق کی) یاددہانی ہے۔ اور کھُلا کھُلا قرآن (اور اس کا کام یہ ہے کہ) ہر اس شخص کو جس (کے خون میں) زندگی کی تڑپ موجود ہو (فطرت کے اٹل قوانین سے) آگاہ کردے اور نہ ماننے والوں پر (ان کی ہلاکت و بربادی سے پیشتر) اتمامِ حجت ہوجائے۔

اس سے معلوم ہوگیا کہ قرآن کی رو سے محض "شاعری" کیوں کسی پیغمبر کے شایانِ شان نہ تھی۔ اور ایک رسول کا پیغام شعر کی تمام لطافتیں اپنے اندر رکھتے ہوئے کس طرح "شعر" سے مختلف ہوتا ہے اس لئے کہ وہ پیغام جس کا سرچشمہؐ خدائے حیّ و قیوم کا علم ازلی ہوتا ہے اس کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوموں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دے، مُردوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونک دے۔ یہی خصوصیت ہے جس کے لئے نوعِ انسانی کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸/۲۴)

اے ماننے والو! اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہا کرو، جب وہ تمہیں اس چیز کی طرف بلاتا ہے، جو تمہیں زندگی بخشتی ہو۔

"شعر" اور قرآن کے اس نمایاں فرق کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ "شاعروں" کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۙ (۲۶/۲۲۵-۲۲۶)

وہ یونہی ادھر اُدھر صحرا نوردیاں اور دشت پیمائیاں کرتے پھرتے ہیں۔ اور ان کے قول و فعل میں

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۔

قلب وزبان میں، کبھی ہم آہنگی نہیں ہوتی۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کے سامنے کوئی منزلِ مقصود ہوگی، زندگی کا کوئی منتہیٰ ہوگا اس کا ہر قدم ایک خاص سمت میں اٹھے گا، اس کا رخ ایک خاص قبلۂ مقصود کی طرف ہوگا، برعکس اس کے جس شخص کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد نہ ہوگا، کوئی منزلِ مقصود متعین نہ ہوگی، وہ شترِ بے مہار کی طرح جدھر منہ اٹھائے گا چل دے گا۔ کبھی تخیلات کی اس حسین وجمیل وادی میں، کبھی تصورات کے اس ہولناک اور بھیانک صحرا میں۔ مقصد پیشِ نظر صرف گرمیٔ سخن ہوگا، اور اس کی خاطر اکثر و بیشتر یہی کرنا پڑے گا کہ دل کچھ محسوس کرے اور زبان کچھ کہے۔ برعکس اس کے ایک شخص کے سامنے زندگی کا ایک خاص مقصد ہے اور وہ مقصد بھی اپنا متعین کردہ نہیں بلکہ وہ جو اس قرآن کریم نے متعین کیا ہے جس پر اس کا ایمان ہے، ایمان کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے قلب و دماغ، اپنے جذبات و افکار کو اس چیز کے تابع رکھے جس پر اس کا ایمان ہے۔ وہ سوچے تو اس کی مدد سے، وہ سمجھے تو اس کی روشنی میں، وہ دیکھے تو اس کے نور سے، وہ حقایق کو پرکھے تو اسی کسوٹی پر، اور قبول کرے تو اس کو جو اس کی رو سے قبول کئے جانے کے قابل ہو، اور رد کرے تو اس کو جو اس کے نزدیک مردود ہو۔ اب اگر ایسا مردِ مومن اپنے خیالات کو (جو دراصل قرآن پاک ہی کے خیالات ہوں گے) زبانِ شعر سے ادا کرے تو مومنین کے اس زمرے میں آجائے گا جس کا ذکر قرآن کریم نے اس آیت میں فرمادیا ہے جو مذکورہ صدر آیت سے متصل ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ... (۲۶/۲۲۷)

مگر وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں، اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور اپنے آپ کی مدافعت اس وقت کرتے ہیں جب ان پر زیادتی کی گئی ہو۔[1]

اقبال اسی زمرہ میں شامل ہے۔ اور علوم حاضرہ کے متعلق فکر اور قرآن فہمی کی جن بلندیوں پر وہ پہنچ چکا تھا، ان کی رو سے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلام نے اس سے پہلے کبھی ایسا مفکر پیدا نہیں کیا۔

لہٰذا اگر یہ درست ہے کہ کسی مفکر کے پیام میں عروسِ معنی کو بے نقاب دیکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے ان جذبات و خیالات کی تہ تک پہنچا جائے، جن پر اس کے فکر کی اساس ہے اور اس سرچشمہ سے واقفیت حاصل کی جائے، جو اس کے تخیلات کا ماخذ ہے تو بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا کلام کما حقہ سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک قرآن کریم نگاہوں کے سامنے نہ ہو۔ جو اس زاویۂ نگاہ سے پیغام اقبال کو دیکھے گا وہ جہاں ایک طرف یہ محسوس کرے گا کہ قرآن کریم انسان کو کن بلندیوں تک اڑا کرلے جاتا ہے، دوسری طرف یہ بھی دیکھ لے گا کہ حضرت علامہ قرآن کریم کے اہم حقایق اور دقیق مسائل کو کس خوبصورتی اور سلاست کے ساتھ ایک شعر میں حل کر کے رکھ دیتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے ایامِ "جاہلیت" میں اقبال کو محض ایک "شاعر" کی حیثیت ہی سے دیکھا اور

---

[1] اس حصہ آیت سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ملت اسلامیہ کو اپنی روش کب کیوں اور کن حالات کے ماتحت بدلنا پڑتی ہے۔

ان کے کلام سے محض "شاعری" ہی کا لطف اٹھایا تھا۔ لیکن جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ کلامِ اقبال کا سرچشمہ کیا ہے تو اس کے بعد ان کی شاعری کی نوعیت ہی بدل گئی۔ اور پھر سمجھ میں آیا کہ اقبال کیا کہتا ہے، کیوں کہتا ہے، اور کیسے کہتا ہے۔ اور یہ راز بھی کھل گیا کہ وہ کونسی شاعری ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اس کا اتباع راہ گم کردہ لوگ ہی کرتے ہیں:۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ (۲۶/۲۲۴)

اور وہ کونسی جو اس منزلِ مقصود کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتی ہے جس کی طرف صراطِ مستقیم لے جاتا ہے۔ ایسا شاعر جس کے متعلق حضرت علامہؒ فرماتے ہیں:۔

شاعر اندر سینۂ ملت چو دل ۔۔۔ ملتے بے شاعرے انبارِ گِل
سوز و مستی نقشبندِ عالمے است ۔۔۔ شاعری بے سوز و مستی ماتمے است
شعر را مقصود اگر آدم گری است ۔۔۔ شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

بہرکیف یہ وہ انداز جس سے میں نے حضرت علامہؒ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے قرآن کریم کو جس نوعیت سے سمجھا ہے اس کی اجمالی سی کیفیت آپ کو معارف القرآن کے ان حصوں سے معلوم ہو گئی ہو گی، جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں۔ قرآن فہمی کے اس اسلوب کی طرف میری رہنمائی کرنے میں جن گرانمایہ ہستیوں کے بارِ احسان سے میری گردن تشکر ہمیشہ نگوں سار رہے گی، ان میں حضرت علامہ کی ذاتِ گرامی ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ میں قرآن کریم کے کسی مشکل مقام پر جا کر رک گیا تو حضرت علامہؒ کے ایک شعر نے ذہن میں ایک ایسی بجلی کی سی چمک پیدا کر دی، جس سے صحیح راستہ فوراً نگاہ کے سامنے آگیا۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوا کہ حضرت علامہ کے کسی شعر کے متعلق کچھ الجھاؤ سا پیدا ہوا تو کسی آیتِ قرآنی نے اپنے "مسیحا" کے اعجاز سے قفلِ ابہام کو کھول دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علامہؒ کی صحیح عظمت ہی اس میں ہے کہ انھوں نے اس دور میں جب کہ مسلمان قرآن کریم سے بہت دور ہو چکے تھے، ان کے سامنے قرآنی تعلیم کو اس حسین و دلکش انداز میں پیش کیا کہ سعید روحیں اپنے ربطِ ہستی کے تاروں اور اس سازِ نغمۂ الست کے پردوں میں ایک کھوئی ہوئی ہم آہنگی یوں محسوس کرنے لگیں، جیسے دامنِ کوہسار کی چاندرات میں دور سے بانسری کی ہلکی ہلکی آواز کسی بھولے ہوئے افسانے کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ قوم کے نوجوانوں کو مذہب سے چڑ سی ہو چکی تھی اور مذہب پرست طبقہ ان کے کھلے ہوئے الحاد اور دہریت کی وجہ سے ان کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ حضرت علامہ نے مذہب کو ایسے انداز میں پیش کیا کہ اس کی روح بھرے ان کے خون کے ذروں میں جذب ہو گئی اور اس طرح وہ غیر محسوس طور پر قرآن کریم کے قریب لا کر کھڑے کر دیئے گئے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مذہب سے بیگانہ ہی نہیں، بلکہ متنفر ہو چکا ہو لیکن کلامِ اقبال سے اسے کچھ ذوق ہو، اس کے سامنے اگر قرآن کریم کو اس کی اصلی

شکل میں پیش کر دیا جائے تو وہ اسے ایک جانی پہچانی ہوئی چیز محسوس کرنے لگتا ہے۔

اب جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا پورا پیام، قرآن حکیم ہی کی تعلیم کی تفسیر ہے تو پیام اقبال پر قرآن کریم کی روشنی میں تمام و کمال تبصرہ ناممکن ہے، جب تک پورے کا پورا قرآن سامنے نہ لایا جائے۔ اس مقصدِ جلیلہ کے لئے میں نے معارف القرآن کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس وقت قرآن کی اساسی تعلیم کے ایک آدھ گوشہ پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی جاسکے گی۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ اقبالؒ کا پیام کس طرح قرآنی حقائق کو اپنے جاذب و دلکش انداز میں پیش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نقطۂ نگاہ سے پیام اقبال کا تجزیہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ یہ ضرورت میرے پیش نظر ہے اور اگر توفیق ایزدی نے میری یاوری کی تو معارف القرآن کی تکمیل کے بعد اس طرف بھی توجہ دوں گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی قرآن فہمی کے لئے بجسقدر حضرت علامہ کی بصیرت کا رہین منت ہوں، اس کے سپاس گذاری کے تقاضے سے میں اپنے اوپر یہ فرض سمجھتا ہوں کہ میں اقبال کے پورے پیغام کو قرآن کی روشنی میں پیش کروں۔ میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس اہم فریضہ سے سبکدوش ہونے کی ہمت اور فرصت عطا فرمائے۔

لَآ اِلٰہَ ـــــــ اِلَّا اللّٰہ

اگر کوئی شخص قرآن کریم کی بنیادی تعلیم کو دو لفظوں میں بیان کرنا چاہے تو وہ نہایت اطمینان سے کہہ سکتا ہے کہ قرآن کریم جو پیغام نوعِ انسانی کو دیتا ہے وہ ہے لَآ اِلٰہَ - اِلَّا اللّٰہ۔ اس کلمہ کے دو حصے ہیں، ایک سلبی (Negative) یعنی اس امر کا یقین، اس حقیقت کا اعتراف، کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جس کے سامنے سر جھکایا جائے، جس کی غلامی اختیار کی جائے، جسے آقا تسلیم کیا جائے، جسے اپنی حاجات کا قبلۂ مقصود سمجھا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے، تخریبی پہلو ہے، یعنی جو کچھ پہلے ذہن میں موجود ہے اسے مٹا دینا ہوگا، بھلا دینا ہوگا۔ جب زمین یوں صاف ہو جائے تو پھر اس پر ایک نئی عمارت تعمیر ہوگی۔ پھر ایجابی پہلو (Affirmative side) آئے گا، تمام قوتوں کے انکار کے بعد اس امر کا اقرار آئے گا کہ ہاں! مگر ایک قوت ایسی ہے جس کی غلامی اختیار کرنا ضروری ہے جس کے سامنے جھکنا زیبا ہے اور جسے اللہ کہتے ہیں۔ تمام قوتوں کو راستہ سے ہٹا کر یوں خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دینا۔ یہ ہے قرآن کریم کی تعلیم۔ دنیا میں اس تعلیم کو سب سے پہلے ایک منضبط شکل میں پیش کرنے والے حضرت خلیل اللہ تھے۔ ان کی حیاتِ مقدسہ کا یہ اہم واقعہ سب کو معلوم ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنی قوم کے صنم کدہ کے تمام بتوں کو پہلے توڑا اور اس کے بعد خدائے واحد کی طرف دعوت دی۔[1] پہلا قدم لَآ اِلٰہَ تھا اور اس کے بعد اِلَّا اللّٰہ۔ جب تک مکان خالی نہ ہو نیا مکین آکر نہیں بستا۔ اس حقیقت کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد سوم۔

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل! یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

اسی لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر سورۂ بقر میں یوں آئی ہے:-

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (۲/۲۵۶)

جو شخص ہر سرکش قوت کا انکار کر کے فقط ایک اللہ پر ایمان رکھتا ہے اس نے ایک ایسے مضبوط سررشتہ کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا!

اسی کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ سے ایک شخص مسلم بنتا ہے۔

بیا کہ مثل خلیل ایں طلسم در شکنیم کہ جزو ہر چہ دریں دیر دیدہ ام صنم است

شرک کے متعلق بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ کسی پتھر کی مورتی کے سامنے جھک جانے ہی کا نام ہے اور بس۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے شرک یہی نہیں بلکہ اللہ کے سوا اور کوئی طاقت ہو، اس کے سامنے جھک جانے کا نام شرک ہے اور یہ قوتیں وہ بت ہیں جن کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں بلکہ یہ خود ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں ان کا مسکن کوئی مندر نہیں بلکہ خود قلب انسانی ہوتا ہے مال و اولاد کا بت، عزت و جاہ کا بت، دولت و ثروت کا بت، حکومت و سلطنت کا بت، ملک و نسب کا بت، اور نہ معلوم کون کون سے لات و منات اور کون کون سے ہبل و عزیٰ ہیں جو ہر آن اس کے محبۂ دماغ میں تراشتے رہتے ہیں جن کے سامنے کھڑا یہ کانپتا ہے، لرزتا ہے، گڑگڑاتا ہے، سجدے کرتا ہے، ماتھے رگڑتا ہے۔ یہی وہ بت جن کے متعلق حضرت علامہ فرماتے ہیں:-

رہ مدہ در کعبہ اے پیرِ حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

یہ بت انسان کی خواہشات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہ ہے شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی شرک کے متعلق فرمایا ہے۔

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ (۴۵/۲۳)

(کیا تو نے اس کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا معبود بنا لیا ہے وہ جسے اللہ نے باوجود علم و عقل کے سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔

کہ علم کا تقاضا تھا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز کرتا۔ لیکن جب جذبات عقل پر غالب آجائیں، جب خواہشات دماغ پر قابو پالیں تو پھر علم و عقل کبھی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتے۔ یہی وہ بت ہیں جن کی وجہ سے انسان قدم قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ فرماتے ہیں:-

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

ایک زنجیر سے اس کا پاؤں نکالا جاتا ہے تو دوسری میں الجھا لیتا ہے ایک کی غلامی کا طوق اس کے گلے سے اتارا جاتا ہے تو دوسرے کی غلامی کا طوق پہن لیتا ہے۔ حالانکہ جس رسول اکرمؐ کی امت ہونے کا یہ مدعی ہے ان کی بعثت کا مقصد ہی ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

(وہ انسانوں کے طوق و سلاسل اتارنے کے لئے بھیجا گیا ہے ان کے بوجھ ہلکے کرنے کو اور ان کے پاؤں سے زنجیریں اتروانے کے لئے)

لیکن اس کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

فکرِ انساں بت پرستے بت گرے — ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرحِ آذری انداختہ است — تازہ تر پروردگارے ساختہ است
کاید از خوں ریختن اندر طرب — نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
بر سرِ ایں باطلِ حق پیر ہن — تیغ لا موجود الا ھو بزن

پھر جب تک دماغ سے ان غیر خدائی قوتوں کو نکالا نہ جائے، خدا کی حقیقت ذہن میں نہیں آ سکتی جب تک لوحِ قلب صاف نہ ہو، توحید کے نئے حروف و نقوش اس پر لکھے نہیں جا سکتے۔ فرماتے ہیں۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے — ترے دماغ میں بتخانہ ہو تو کیا کہئے

یہی منفی اور مثبت کے دو ٹکڑے ہیں، جن کے جوڑنے سے کلمۂ توحید بن سکتا ہے، جب تک آپ دوسرے آقاؤں کو جواب نہیں دیتے، کبھی نئے آقا کی غلامی اختیار نہیں کر سکتے۔ جب تک اس پرانی دنیا کو ویران نہیں کیا جاتا جہانِ نو کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس زنگ کو اتارا نہیں جاتا، تلوار پر نئی آب نہیں چڑھ سکتی۔ رموزِ بیخودی میں ارشاد ہے۔

آتشے افروز از خاشاکِ خویش — شعلۂ تعمیر کن از خاکِ خویش

اس کو برنگِ ریختہ یوں بیان کیا گیا ہے:۔

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو — خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتگرِ باطل بھی تو

حق آنے سے باطل خود بخود فنا ہو جاتا ہے اندھیرے کی فطرت ہی یہ ہے کہ جب چراغ آ جائے تو گھر چھوڑ جائے۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔ (۱۷/۸۱)

(کہئے کہ حق آیا اور باطل غائب ہو گیا، باطل تو بنا ہی اس لئے ہے کہ فنا ہو جائے)

پھر یہ بھی دیکھئے کہ اس فروغِ حق کے لئے کرنا کیا چاہئے۔ فرمایا:۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ — پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار — اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار — تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

حضرت علامہؒ کے کلام میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے الفاظ کے انتخاب میں جہاں "حسنِ شعریت" ملحوظ ہوتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہتی ہے کہ ان الفاظ کا استعمال محض برائے "بیت گفتن" نہ ہو، بلکہ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ بھی قرآن کریم کے مختلف حقائق کے آئینہ دار ہوتے ہیں اگر میں اس لحاظ سے ان کے اشعار اور اشعار کے الفاظ کی تشریح کرنے لگوں تو ظاہر ہے کہ ع

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

ہر چند جی چاہتا ہے کہ ایسا بھی ہوتا کہ ان کے کلام کی عظمت پورے طور پر سامنے آجائے۔ لیکن عدم گنجائش مانع ہے۔ مثال کے طور پر مذکورۂ صدر اشعار کے پہلے شعر میں "صداقت کے لئے مرنے کی تڑپ" کا ذکر ہے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوکتِ الفاظ شعر میں حرارت پیدا کرنے کے لئے ہے لیکن حقیقت اس سے کہیں بلند ہے۔ نبی اکرمؐ کے سامنے یہود وغیرہ بہت سی حجتیں پیش کرتے بحث وجدل کا تقاضا کرتے لیکن قرآن کریم نے سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لئے ایک اور ہی معیار پیش کردیا اور چیلنج دیدیا کہ آؤ اس کسوٹی پر پورے اترو۔ فرمایا۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۹۴)

(اگر تم سچے ہو تو ذرا موت کی تمنا کرکے دکھاؤ۔ مرنے کی تڑپ پیدا کرو۔ یہ ہے صداقت کی پہچان)

دیکھئے حضرت علامہ اس حقیقت کو ایک مصرع میں کس خوبصورتی سے بیان کر گئے ہیں۔ دوسرے مصرع میں "پیکرِ خاکی میں جان پیدا کرنے" کے الفاظ آئے ہیں۔ لیکن ان کی تشریح کے لئے مجھے قرآن کریم کی روشنی میں پورے نظریۂ ارتقاء (Theory of Evolution) کو بیان کرنا ہوگا اسی لئے اس مقام پر اس کی تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔[1]

ہاں کہا یہ جارہا تھا کہ لَا کی تخریب کے بعد اِلّا کی تعمیر کی جائے جب آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ دورِ حاضرہ جو کثیر اضطراب اور عدمِ اطمینان کا دور ہے اپنی ہر روش میں لَا ہی لَا کا اصول اختیار کئے جارہا ہے اور اس تخریب کو جہادِ زندگی سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ یہ محض استہلاک (Destruction) ہے تعمیر (Construction) نہیں۔ مذہبی معتقدات، اخلاقی اصول، سماجی کی مسلمہ روایات، سب اسی سیلابِ لَا کی نذر ہوچکے ہیں، اور اس کے بعد اِلّا کی تعمیر کہیں شروع نہیں ہوتی، حالانکہ تخریب سے غرض ہی ایک نئی تعمیر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

فضائے نور میں کرتا نہ شاخ و برگ و بر پیدا | سفر خاکی شبستاں سے نہ کرسکتا اگر دانہ
نہادِ زندگی میں ابتدا لَا۔ انتہا اِلّا | پیامِ موت ہے جب لَا ہوا اِلّا سے بیگانہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے معارف القرآن جلد دوم، عنوان انسان۔

عصرِ حاضر کے متعلق ارشاد ہے:۔

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے	مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ اِلّا

روس اس لا کے جنون میں سب سے زیادہ شدت سے گرفتار ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد ہی نفی سے شروع ہوتی ہے۔ خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، املاک کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی، (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) عائلی زندگی کی نفی، تدبیر منازل کی نفی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض چیزوں کی نفی تھی بھی ضروری۔ لیکن محض نفی سے تو کام نہیں چل سکتا۔ نفی کے بعد اثبات کی بھی تو ضرورت تھی۔ توہمات کو چھوڑتے تو حقائق پر ایمان لاتے۔ اس تفریط (Extremism) اس یکسر کفر (انکار) ہی کا تو نتیجہ ہے کہ دنیا بھر میں انقلاب کے مدعی خود اپنے اصولوں میں اس قدر عجلت سے تبدیلیاں پیدا کئے جا رہے ہیں کہ باریک بین نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ پھر وہیں پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔ روس کے متعلق ارشاد ہے۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ	لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند	مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں	خویش را زیں تندباد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات	سوئے اِلّا می خرامد کائنات
لا و اِلّا ساز و برگِ امتاں	نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں

دو ہی صفحے پہلے ہے:۔

نکتۂ می گویم از مردانِ حال	امتاں را لا جلال اِلّا جمال
لا و اِلّا احتسابِ کائنات	لا و اِلّا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون	حرکت از لا زاید از اِلّا سکون

اس آخری مصرع کو غور سے دیکھئے۔ جب تک قومیں لا کے بحران میں رہتی ہیں عدم سکون و فقدان طمانیت کے گرداب میں چکر کھاتی ہیں۔ کسی محکم چٹان پر ان کا قدم نہیں جمتا۔ آج ایک نظریہ قائم ہوتا ہے، دنیا میں شور مچ جاتا ہے کہ بس وہ مداوا ہاتھ آگیا جس سے تمام دنیا کے دکھ درد دور ہو جائیں گے۔ ابھی چار قدم بھی اس کی روشنی میں چلنے نہیں پاتے کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جسے تریاق سمجھ رہے تھے وہ زہر ہے جسے چشمۂ حیواں تصور کئے بیٹھے تھے وہ سراب ہے۔ اسے ڈھا دیا جاتا ہے اور پہلے کی طرح ایک اور فریب تیار کر لیا جاتا ہے وہ چار قدم اس کی روشنی میں چلتے ہیں پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگ جاتے ہیں كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا (۲/۲۰) جب ذرا بجلی چمک پڑتی ہے تو اس میں دو قدم چل لیتے ہیں، اور جب وہ روشنی غائب ہو جاتی ہے تو پھر کھڑے ہو کر آسمان کی طرف تکنے لگ جاتے ہیں۔ یہ ہے متذبذب زندگی کا وہ جہنم جس میں آج ساری دنیا گرفتار ہے اور نتیجہ ہے اس اِلّا کے نہ ہونے کا

اس عملی شرک کا۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ

سَحِيْقٍ - (۲۲/۳۱)

جو اللہ سے شرک کرتا ہے اس کی حالت یوں سمجھئے کہ گویا وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں
پر آگرا۔ یا جیسے (مرغی کے چوزے کی کوئی (عقابی پنجوں والا) پرندہ اچک کر لے جائے یا جیسے
تند و تیز ہوا کے جھونکے (پرکاہ کی طرح) اسے کسی دور دراز مقام پر پھینک دیں۔

گویا اس نظام کا مرکز ثقل گم ہو جاتا ہے جس میں لَا ہی لَا ہو، اِلَّا نہ ہو۔ وہاں حرکت ہی حرکت ہوتی ہے، سکون نہیں ہوتا۔ لیکن جم کر کھڑے ہونے کی مہلت نہیں ملتی۔ اسی لئے فرماتے ہیں کہ۔

بخود خزیدہ و محکم چوں کوہساراں زی ٭ مزی چوں خس کہ ہوا تند و شعلہ بیباک است

اس تعمیر کا سبق وہ ملت اسلامیہ کے ان نوجوانوں کو دیتے ہیں جو لاعلمی کی وجہ سے اس قسم کی نفی کی طغیانیوں میں بہے چلے جا رہے ہیں۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ٭ ہر کہ در ورطۂ لَا ماند بہ اِلَّا نہ رسید

اور ان مسلمانوں کو جو ہزار ہزار تسبیح پڑھنے کے باوجود۔ لَا اِلٰہ۔ اِلَّا اللہ کے معنی نہیں سمجھتے، پھر سے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں کہ

کافر! دل آوارہ دگر بارہ باو بند ٭ بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند
دیدن دگر آموز شنیدن دگر آموز

پھر سے سیکھ کہ لَا کہاں تک جائے گا، اور اِلَّا کہاں سے شروع ہوگا۔

جب تک انسان لَا کے بھنور میں رہتا ہے۔ وہم و قیاس آرائیوں کا تختۂ مشق بنا رہتا ہے اور آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تذبذب اور گمان میں قلب انسانی کس جہنم میں رہتا ہے۔ اطمینان و سکون یقین میں ہے اور یقین پیدا نہیں ہو سکتا جب تک اس سلبی لَا کے بعد ایجابی اِلَّا نہ آجائے۔ اس کیفیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو زباں تو ہے ٭ یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

مومن خدائے لم یزل کا دست قدرت کیسے بنتا ہے؟ اس کی تفسیر دیکھنی ہو تو قرآن کریم میں واقعۂ بدر دیکھئے۔ کہتے ہیں کہ واٹرلو کی لڑائی نے یورپ کی تاریخ بدل دی لیکن جن کی نگاہیں دور رس اور دقیقہ شناس واقع ہوئی ہیں ان کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہے کہ بدر کی لڑائی نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔ اگر اس وقت خدا نکردہ مسلمان مجاہدین کی وہ مٹھی بھر جماعت جو اونٹوں کی پسلیاں اور کھجوروں کی ٹہنیاں لے کر سربکف میدان میں آگئی تھی کہیں ضائع ہو جاتی تو آج دنیا پر توہم پرستی کے گھناؤنے بادل منڈلا رہے ہوتے، اور کوئی نہ جانتا کہ علم و عقل، شعور و ادراک، حکمت و فلسفہ کیا شے ہے، اور کوئی نہ پہچانتا کہ انسان کی اس دنیا میں

صحیح پوزیشن کیا ہے آج نہ اقبال ہوتا نہ اقبال کے یہ قلب و دماغ میں چمک پیدا کرنے والے حقائق اور روشن میں برقِ تپاں بن کر دوڑ جانے والے شعر۔ ہاں تو اس بدر کی لڑائی میں، جب کہ تین سو بارہ، بظاہر بے کس و بے بس مسلمانوں کا مقابلہ قوت اور سامان کے ہجوم کے ساتھ تھا مومنین کے دست و بازو خدا کے ہاتھ بنے۔ فرمایا کہ:۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۔ (۸/۱۷)

تم نے ان دشمنوں کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے تم نے تیر اندازی نہیں کی، بلکہ وہ تو اللہ نے کی ہے (تلواریں تمہاری تھیں اور ان میں بجلیاں ہمارے غضب کی کوند رہی تھیں۔ تیر تمہارے تھے اور ان کی انیوں کے ساتھ قضائیں ہماری لپٹ رہی تھیں)

یہ تھے وہ دست و بازو جن کے متعلق فرمایا کہ:۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زورِ بازو کا ۔۔۔ نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

لیکن برعکس یقین کے جو شخص مغلوبِ گمان رہتا ہے، جو ایمانِ محکم کی بجائے تذبذب و وساوس میں الجھا رہتا ہے اس کی تمام محنتیں اکارت جاتی ہیں، تمام کوششیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ تمام ساز و سامان، تمام جیوش و عساکر دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گولی چلانے والا اپنا کارتوس بھی ضائع کر دیتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ (۵/۵)

جس نے ایمان و یقین سے انکار کیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے۔

لیکن جب اس میں ایمان پیدا ہو جائے تو پھر انہی بازوؤں کی پرواز حدود فراموش اور انہی ہاتھوں کی قوتیں وسعت ناآشنا ہو جاتی ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا ۔۔۔ تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

قرآن کریم میں انہی لوگوں کے متعلق ہے کہ:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱/۳۰)

یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس یقین پر جم کر کھڑے ہو گئے تو ان پر خدا کے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ (جو انہیں بشارت دیتے ہیں کہ مت ڈرو، بالکل نہ گھبراؤ، تمہارے لئے خوشخبری ہے اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

جب انسان میں ایمان و یقین کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کی نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ وہ ہر ایک شے کو ایک نئے انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھ پر کسی خارجی اثر کا رنگین چشمہ نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہاں پہنچ کر حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم　　ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم　　جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم

قرآنِ کریم نے علم کی جو تعریف کی ہے وہ یہی ہے کہ علم اپنے سمع، بصر اور قلب کی شہادت سے حاصل ہوتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا۔

جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگو۔ یاد رکھو سمع، بصر اور قلب ہر ایک کی بابت پرسش ہوگی۔

پوچھا جائے گا کہ جس چیز کو تم نے بطورِ علم کے تسلیم کیا تھا اسے تم نے سماعت و بصارت کی رو سے تجربات و مشاہدات کے ذریعے پرکھ کر دیکھ لیا تھا کہ واقعی یقینی شے ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تمہارے قلبِ سلیم کو بھی اپیل کرتا تھا۔ اس کے برعکس ان ذرائع سے کام نہ لینے والے کو قرآن کریم نے جہنمی قرار دیا ہے، وہ لوگ کہ جو۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔

دل و دماغ رکھتے ہیں، لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان رکھتے ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ تو بالکل ڈھور ڈنگر ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے، ان سے بھی زیادہ بے راہ رو۔[1]

بیکن نے علم کے متعلق یہی نظریہ استقراء پیش کیا اور یورپ کی کایا پلٹ دی۔ اور قرآن کریم نے چودہ سو برس پیشتر علم کی یہی تعریف بیان فرمائی۔ لیکن قرونِ اولیٰ کے بعد مسلمانوں نے اسے غلاف اڑھا کر اونچے اونچے طاقوں میں نہایت ادب و تعظیم سے رکھ چھوڑا اور خود اندھوں کی طرح دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلتے گئے کہ وہ گڑھے میں گرے تو یہ بھی ساتھ ہی جائیں۔

ہاں تو حضرت علامہ علم کی اسی قرآنی تعریف کے متعلق فرماتے ہیں کہ "جہاں را جز بہ چشمِ خود ندیدم" اسی "چشمِ خود" کے متعلق ضربِ کلیم میں ہے:۔

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے　　افلاک منور ہوں ترے نورِ سحر سے
خورشید کرے کسبِ ضیا تیرے شرر سے　　ظاہر تری تقدیر ہو سیمائے قمر سے
دریا متلاطم ہوں تری موجِ گہر سے　　شرمندہ ہو فطرت ترے اعجازِ ہنر سے
اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

---

[1] اسلام کو عقل و بصیرت کے خلاف کہنے والے زیادہ نہیں تو انہی دو ایک آیات پر غور فرمائیں اور دیکھیں کہ ایسا مذہب کبھی علم و بصیرت کے خلاف ہو سکتا ہے!

یہ ہے جہان کو اپنی نظر سے دیکھنا۔ یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر دیکھئے کہ آپ کی دنیا میں کیسا تحیر انگیز انقلاب ...... پیدا ہو جاتا ہے۔ نگہ کے بدل جانے سے ہر شے کی نوعیت بدل جاتی ہے، دنیا کا نقشہ بدل جاتا ہے، اشیاء کی قیمتیں بدل جاتی ہیں۔ اور قرآن کریم کے الفاظ میں یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ۔ یہ زمین بدل جاتی ہے یہ آسمان بدل جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

بخود نگر، گلہ ہائے جہاں چہ می گوئی　　　اگر نگاہ تو دیگر شود جہان دگر است

جاوید نامہ میں ہے۔

ایک منزل را نمی دانی ز رہ　　　قیمت ہر شے ز اندازِ نگہ
نوعِ دیگر بیں، جہاں دیگر شود　　　ایں زمین و آسماں دیگر شود

یہی وہ نگاہیں ہیں جن سے قوموں کی تقدیریں بدل جاتی ہیں اور یہی وہ نگاہیں ہیں جو بدبختی سے ہماری قوم کے نوجوانوں سے چھن چکی ہیں جنہیں وہ بزعم خویش اپنی نگاہیں سمجھتے ہیں۔ اور وہ اپنی نہیں ہوتیں دوسروں کی مستعار ہوتی ہیں۔ یہی وہ متاع گراں بہا ہے جس کے چھن جانے پر ہر رونے والی آنکھ روتی ہے اور ہر تڑپنے والا دل تڑپتا ہے۔ یہی نوجوانوں کی "بے بصری" اقبال کو بھی ہو رُلاتی ہے اور اس نے اپنے قلب و دماغ کے بہترین جوہر اسی جہاد میں صرف کر ڈالے ہیں کہ کہیں سے یہ فردوس گم گشتہ پھر نوجوانوں کو مل جائے۔

لیکن مومن کی "چشم خویش" یہ اپنی آنکھ اس وقت اپنی بنتی ہے جب یہ قرآن کی روشنی میں اس آنکھ سے کام لے۔ کہ جس طرح آنکھ باہر کے نور، بیرونی روشنی کے بغیر بیکار ہے دیدہ عقل قرآن کریم کے نور مبین کے بغیر بالکل کور ہے۔ اسی کے متعلق نبی اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ خدا کا نور قرآن کریم ہے۔ ایک مرد مومن دنیا کی ہر شے کو قرآن کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اس کے افکار و آرا اس کے تابع چلتے ہیں۔ اس کا علم و فلسفہ اس کی پیروی کرتا ہے۔ یہ ہے فرق ایک مومن اور غیر مومن حکیم میں۔ غیر مومن یا تو تنہا اپنی عقل کے زور پر چلتا ہے اور قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے یا دوسرے انسانوں کے پیچھے پیچھے قدم بقدم چلتا ہے کہ اگر وہ جہنم کا راستہ اختیار کئے ہے تو یہ بھی وہیں پہنچے گا۔ برعکس اس کے ایک حکیم مومن اپنی عقل و خرد سے قرآن کریم کی روشنی میں کام لیتا ہے اور چونکہ یہ روشنی خدائے علیم و خبیر کی عطا فرمودہ ہے۔ اس لئے وہ اشیاء کی حقیقتوں کو بے نقاب کر دیتی ہے اور انسان پھر کہیں لغزش نہیں کھاتا۔ یہ ہے وہ حصہ "اِلّا" جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے اور جس سے محروم رہنے کی وجہ سے آج دنیا جہنم زار بن رہی ہے۔

اور یہ حصہ "اِلّا"، یہ خدا کے غیر متبدل قوانین، یہ فطرت کے اٹل حقائق، سوائے قرآن کریم کے دنیا میں آج اور کہیں نہیں ہیں۔ چونکہ حضرت علامہ کو معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم انسان کو کس قسم کی بصیرت عطا کرتا ہے یہ نگاہوں کو کس اوج تک پہنچا دیتا ہے، یہ قلب انسانی میں کیا کیا انقلاب پیدا کر دیتا ہے، یہ کس طرح اس کی ساری دنیا بدل دیتا ہے، اس لئے جہاں کہیں وہ قرآن کریم کا ذکر کرتے ہیں تو وجد مسرت سے جھوم اٹھتے

ہیں. ان کے ایک ایک لفظ سے قرآن کریم سے عشق و محبت کی چاشنی ٹپکتی ہے، وہ خود بھی اس میں جذب ہو جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی جذب کر لیتے ہیں. رموز میں فرماتے ہیں:-

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست — زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم — حکمتِ اولایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں — حاملِ او رحمۃٌ للعالمیںؐ

پھر اور سنئے:-

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں مسلماناں اگر داری نظر — در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر
صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست — ہر جہاں اندر برِ او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش — می دھد قرآں جہانے دیگرش

دو چیزیں قابلِ غور ہیں. ایک تو "ضمیرِ خویش" اور دوسرے "عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست" اس عصرہا پیچیدہ کی خوبصورتی دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے. قرآن کریم کی آیات کو کھولتے جائیے، جہاں اندر جہاں، زمانہ در زمانہ ان کے اندر لپٹا ہوا ملے گا. قرآن کتابِ فطرت ہے، یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی جا کر یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اسی طرح قرآن بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا، جو کچھ میرے اندر تھا سب باہر آچکا. اب میں خالی برتن ہوں، اب کسی اور رہبر کی تلاش کرو، قطعاً نہیں، فطرت کی کسی چیز کو لیجئے. مثلاً پانی، حضرت آدمؑ کے وقت میں لوگ اتنا ہی جانتے ہوں گے کہ اس سے پیاس بجھائی جاتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جاتا ہے، لیکن اس پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ، وسعت و بلندی کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں جیسے وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں. آج دیکھئے اس پانی سے کس قدر کام لئے جا رہے ہیں. کیا حضرت آدمؑ کے وقت کے پانی میں یہ خصائص موجود نہ تھے! یا کیا دنیا آج یہ کہہ سکتی ہے کہ پانی میں جو کچھ تھا سب معلوم کر لیا گیا ہے. دنیا اپنے تجربات کی جن بلندیوں تک چاہے اُڑتی چلی جائے فطرت کی اشیاء ان کا ساتھ دیتی جائیں گی. اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی، آج اس میں ایتھر کی امواج نے کیا کچھ کر دکھایا ہے. کیا ایتھر پہلے موجود نہ تھا! کیوں نہ تھا. اسی خلا میں لپٹا ہوا تھا، پیچیدہ تھا. یہی قرآن کریم کی کیفیت ہے. زمانہ علم و عقل کی جن پہنائیوں تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے، قرآن اس سے بھی آگے نظر آئے گا، جو بات

آج سمجھ میں نہیں آسکتی اسے کل کی آنے والی نسلیں جو اگر تجربات و مشاہدات میں موجودہ نسل سے آگے ہونگی خود بخود سمجھ جائیں گی۔ اسی طرح قرآن کی ایک ایک آیت حقیقتِ ثابتہ بن کر سامنے آتی جائے گی اس وقت اس کی کوئی آیت متشابہ نہیں رہے گی۔ سب محکم ہو جائیں گی۔ یہ میں نہیں کہتا، خود قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۔ (۴۱/۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی نشانیاں اس نظامِ کائنات میں اور خود نفسِ انسانی کے اندر دکھاتے جائیں گے یہاں تک کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن فی الواقعہ حق ہے۔

اس نظامِ کائنات میں انسان کی صحیح پوزیشن کیا ہے! اسے سب سے پہلے قرآن کریم نے ہی متعین کیا ہے۔ یہ اعلان آپ کو قرآن ہی میں ملے گا کہ

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جَمِيعًا ۔

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے اندر ہے، جو کچھ ان پستیوں اور بلندیوں میں ہے سب کچھ تمہارے لئے تابع فرمان کر رکھا ہے۔

یہ تو اس کائنات سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم تو اس سے بھی آگے جاتا ہے (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا) حضرت علامہ انسان کی گزری ہوئی کہانیوں کی تحقیق میں زیادہ کاوش پسند نہیں فرماتے کہ وہ ایک نظری سی شے ہے۔ ہماری آج کی دنیا پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ

خردمندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

قرآن کریم کوئی علم الحیات (Biology) کی کتاب نہیں کہ اس میں ان امور کی ریسرچ دے رکھی ہو۔ بایں ہمہ جہاں کہیں ضمناً تخلیقِ انسانی کا ذکر اس میں آگیا ہے جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس پر انسان اپنے کمالِ تحقیق کے بعد پہنچے گا۔ یہی حالت دیگر علوم سائنس کے متعلق ہے قرآن میں تبعاً اور ضمناً جہاں جہاں ان کا ذکر آگیا ہے وہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، ہو نہیں سکتا کہ انسانی انکشافات جس نتیجہ پر پہنچیں قرآن اس کے خلاف ہو، بشرطیکہ وہ انکشاف حقیقت کی حد تک پہنچ چکا ہو، محض قیاس آرائی ہی نہ ہو۔ انسانی انکشاف ہے کیا؟ یہی نا کہ فطرت کی ایک حقیقت پر پردہ پڑا ہوا تھا، وہ نظروں سے اوجھل تھی۔ انسانی کد و کاوش نے وہ پردہ اٹھا دیا وہ حقیقت جیسی تھی سامنے آگئی۔ اسی کو انکشاف کہتے ہیں۔ اثیر اس فضا میں موجود تھا۔ بجلی کی لہریں یہیں تڑپ رہی تھیں۔ اتنا ہی تھا کہ پہلے نگاہ سے اوجھل تھیں۔ اب بے نقاب ہو کر سامنے آگئیں۔ لیکن خدا وہ ہے جس نے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اگر یہ چھپی ہوئی ہوتی ہیں تو انسانوں کی نگاہوں سے چھپی ہوئی ہیں، خدا کی نگاہوں سے تو چھپی ہوئی نہیں ہوتیں۔ اسی لئے جہاں کہیں خدا ان کا ذکر کرے گا، وہ تو ایسے ہی کرے گا جیسے کوئی اس چیز کی بابت کچھ کہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے بے نقاب موجود ہو۔ پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسانی

انکشافات کے نتائج اور قرآن کریم کا بیان باہمی تضاد ہوں۔ جہاں کہیں تضاد ہو سمجھ لیجئے کہ انسانی تحقیق میں ابھی غلطی ہے جسے وہ حقیقت سمجھ رہا ہے قیاس آرائی ہے کہ جب حقیقت، حقیقت ہو کر سامنے آجائے گی تو وہ وہی ہوگی جو اس حقیقت کے پیدا کرنے والے نے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہے، اس نظریۂ ارتقا کو لیجئے دورِ حاضرہ کے انکشافات میں ایک معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ میں جو چیزیں بطور حقیقت کے معلوم ہو چکی ہیں وہ وہی ہیں جن کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور جن کی روشنی میں اسلامی مفکرین مثل فارابی، اور ابن مسکویہ نے ویلیس اور ڈارون سے کہیں پہلے ان نظریوں کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ (نظریۂ ارتقاء اور قرآن کریم ایک جداگانہ بحث ہے، جسے کہیں اور بیان کیا جائے گا) لیکن یورپ کے حکماء اس نظریہ کے ماتحت انسان کی سابقہ کڑیوں کی تحقیقات کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں اور انسان کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتے ہیں، کہ اس کی موت کے ساتھ یہ سلسلۂ ارتقاء بھی منقطع ہو جاتا ہے لیکن قرآن کریم اس حصہ زندگی کو محض ابتدا قرار دیتا ہے وہ کہتا ہے منزل تو ابھی شروع ہوئی ہے۔ انسان کی موت اس سلسلۂ ارتقاء کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک اگلی کڑی کی ابتدا ہے۔ آپ دیکھئے کہ سلسلۂ ارتقا میں جمادات سے نباتات اور نباتات سے حیوانات تک آتے آتے ایک نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ اگلی منزل میں بمقابلہ پچھلی منزل کے ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو مجرد مادہ میں موجود نہ تھی۔ مادہ غیر شعوری شے ہے اس میں تعقل و ادراک نہیں۔ لیکن مٹی سے درخت اور درخت سے حیوان کی تدریجی ترقی میں یہ کیفیت نظر آئے گی کہ وہ چیز جو مادہ میں مفقود تھی، ان کی اگلی کڑیوں میں پیدا ہوتی چلی جارہی ہے۔ حیوانات میں ایک خفیف سی حد تک عقل و شعور آجاتا ہے اور اس سے اگلی منزل یعنی انسان میں یہ خصوصیت ابھر کر سطح پر آجاتی ہے۔ شعور و ادراک، جذبات و احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو مادہ میں موجود نہ تھی۔ گویا سلسلۂ ارتقاء کی ہر کڑی میں "مادیت" سے کسی "غیر مادیت" کی طرف قدم اٹھتا ہے۔ "خاکی" سے کچھ "نوری" سا ہو جاتا ہے۔ ہر چند یہ "غیر مادی" عنصر اسے ایسا ہی کہنا چاہئے کیونکہ اور کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا نہیں کر سکتا) انسان میں اگر نمایاں ہو گیا ہے لیکن بایں ہمہ یہ عنصر ابھی اپنے عہدِ طفولیت میں ہے، لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ سلسلہ یہیں ختم ہو جائے۔ اس کا آگے بڑھنا ضروری ہے اور یہی آگے بڑھنے کی منزلیں ہیں، جہاں جا کر یورپ کے حکماء اور ایک مسلم حکیم میں فرق شروع ہوتا ہے۔ حکیم مومن کے نزدیک حیات ایک مسلسل شے ہے اور موت اس کا خاتمہ نہیں کر دیتی، بلکہ شبِ تیرہ و تار کے بعد ایک نیا دن طلوع کرتی ہے، مادی عنصر میں تو تاریکی ہی تاریکی ہے، یہ عقل و خرد، یہ شعور و ادراک کی چمک تو مادہ سے آگے بڑھنے میں ہی پیدا ہوتی ہے، لہٰذا یہ سلسلۂ ارتقا جتنا آگے بڑھتا جائے گا، تیرگی درخشندگی میں تبدیل ہوتی جائے گی۔ وہ لوگ جن کے اس منزل میں اعمال صالح ہوں گے یعنی ایسے کام جو اس میں یہ صلاحیت پیدا کر دیں کہ وہ اس سے اگلی زندگی اس سے نفیس و لطیف، اس سے

اعلیٰ وارفع زندگی بسر کر سکے۔ وہ اوپر کی منزل میں چلے جائیں گے جسے جنت کہتے ہیں جن کے اعمال انھیں اصلح نہیں بنائیں گے وہ سلسلہ ارتقا کی اگلی منزل میں نہیں پہنچ سکیں گے، وہیں روک دیئے جائیں گے یہ جہنم کی زندگی ہوگی۔ لہٰذا موجودہ زندگی تو انسانی خمیر کے آب و گل کی زندگی ہے، ذرا اسے سنور لینے دیجئے پھر دیکھئے یہ کیا بنتا ہے۔" انسان کا مستقبل یہ ہے وہ موضوع جو حضرت علامہ کے تمام کلام کا گویا نقطۂ ماسکہ ہے فرماتے ہیں:-

بکے درمعنیٔ آدم نگر از من چہ می پرسی ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے
چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے کہ یزداں را دل از تاثیر او پر خوں شود روزے

اس نظامِ کائنات میں انسان کا درجہ کس قدر بلند ہے اس کے لئے اس داستانِ حقیقت کشا کو دیکھئے جو تخلیقِ آدم کے باب میں پہلے ہی پارہ میں تمثیلاً بیان کی گئی ہے، اور جس میں فطرتِ انسانی سے خطاب ہے حضرت آدم گویا تمام نوعِ انسانی کے نمائندہ ہیں۔ فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً۔ میں دنیا میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کی معصوم نگاہیں جب اس ہیولیٰ آب و گل کو دیکھتی ہیں تو اس میں خون کے چھینٹے اور آگ کی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ عرض کرتے ہیں کہ بارِ الٰہا! یہ فتنہ سامانیوں کا مجموعہ، اور خلیفہ فی الارض!! اس اعزاز کے مستحق تو کچھ ہم ہی نظر آتے ہیں کہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور اپنے اختیار و ارادہ سے کام لئے بغیر وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے۔ خلاقِ فطرت کے چہرے پر ایک حسین تبسم نے گل فشانی کی اور فرمایا کہ اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں جانتا ہوں کہ یہ مضمون ہو کر کیا بننے والا ہے" اور تم کیا ہو۔ لیکن اتنا کہہ کر فرشتوں کو ساکت ہی نہیں کر دیا گیا، بلکہ اس کے ثبوت میں عظمتِ آدم کی ایک جھلک بھی دکھا دی۔ اسے علم الاشیاء (علم الفطرت) عطا کیا گیا اور فرشتوں سے پوچھا کہ تم بھی اس کی نسبت کچھ جانتے ہو؟ انھوں نے گردنیں جھکا دیں اور عرض کیا کہ حضور! لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ہمیں تو اتنا ہی پتہ ہے جتنا ہمیں سکھایا گیا ہے فرمایا کہ اب بتاؤ کہ یہ ہمارے رازوں کا امین، یہ عظمتوں کا پتلا، اس قابل ہے یا نہیں کہ تم اس کے سامنے جھک جاؤ؟ اب سوائے اعترافِ حقیقت کے چارہ کیا تھا، وہ جھکے اور بار بار جھکے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ:-

کجا نورے کہ غیر از قاصدی چیزے نمی داند کجا خاکے کہ در آغوش دارد آسمانے را

بالِ جبریل میں فرماتے ہیں:-

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

ذرا غور کیجئے اس فلسفہ پر نظامِ فطرت کی ہر شے اس غرض سے پیدا کی گئی ہے کہ انسان اس سے کچھ کام لے یا وہ انسان کی کچھ خدمت بجا لائے۔ ان اشیاء کا وجود انسان کی زندگی اور زندگی کی ضروریات کے لئے ہے۔ ہوا نہ رہے تو انسان بھی نہ رہے، پانی نہ رہے تو انسان نہ رہے۔ لیکن اگر روئے زمین پر کوئی

انسان باقی نہ رہے تو بھی سلسلۂ کائنات اسی طرح جاری رہے۔ اس میں کوئی نقص واقع نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کا وجود اس نظامِ کائنات کے لئے نہیں۔ اس کی تخلیق سے یہ غرض نہیں کہ اسی دنیا کا رہ جائے۔ دنیا اس کی خاطر ہے یہ دنیا کی خاطر نہیں۔ یہ اس سے کسی بلند و بالاتر مقصد کے لئے پیدا کیا گیا اور یہی چیز اسے نظامِ کائنات سے ممتاز کر دیتی ہے۔ لیکن یہ شرفِ اجتباء یہ امتیاز و خصوصیت محض ایک انسان کے گھر میں پیدا ہو جانے سے ہی نہیں حاصل ہو جاتی۔ اس کے لئے ایک "یقینِ کامل" اور "عملِ پیہم" کی ضرورت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ "خیرِ امت" بن جاتی ہے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس خیرِ امت کا مقام کس درجہ بلند ہوگا۔ اس جماعت کے بھولے ہوئے فرد سے خطاب کر کے فرماتے ہیں:۔

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو — قطرہ ہے لیکن مثالِ بحرِ بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتارِ طلسمِ ہیچ مقداری ہے تو — دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکتِ طوفاں بھی ہے
ہفت کشورجس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

یہی وہ ہیں جن کے متعلق ارشاد ہے کہ:۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (۳/۱۳۹)

مت گھبراؤ، مت خوف کھاؤ، تم تو دنیا میں سب سے بلند ہو، بشرطیکہ تم مومن بن جاؤ!

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے — یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی — ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی، مکیں فانی، ازل تیرا، ابد تیرا — خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تُو ہے
تیری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی — جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک بہترین قوم بنایا کہ تم تمام نوعِ انسانی کے (اعمال کے) نگراں رہو اور تمہارے (اعمال کے) نگراں رسول ہوں۔

مسلم کی تو شان یہ ہے کہ یہ تمام دنیا کی قوموں کے اعمال کا جائزہ لیتا رہے کہ کون ٹھیک کام کر رہا ہے اور کون راستے سے ہٹ گیا ہے یہ تو تمام اقوامِ عالم کا نگرانِ کار (Supervisor) بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اور مرکزِ ملت اس کے اعمال کا نگراں۔ اور تمام دنیا کی اقوام اس کی روش کو اپنے لئے نمونہ قرار دیں کہ ہمیں یہ کچھ بننا چاہئے اور اس طرح ہر قوم اپنے اپنے اعمال کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لے کہ درست ہیں یا غلط! کس قدر درست ہے کہ

جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے

جب مومن کے علوِ مرتبت کی یہ شان ہو تو پھر دنیاوی حکومت و ثروت اس کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے؟ یہ تو بنی ہی اس کے لئے ہے۔ یہ تو اس کی وراثت ہے، کسی اور کے پاس جا ہی نہیں سکتی۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس فقط کو دیکھئے کسی اور کا اس میں حصہ نہیں، یہ بطور حق کے اس پر قابض ہوگا۔ کوئی اور اسے اس سے چھین نہیں سکتا۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور کس قدر سچا فیصلہ۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱/۱۰۵)

اور یقیناً ہم نے زبور میں، نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بیشک یہ تمام زمین ہمارے صالح بندوں کی میراث ہے۔

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اور یہ اس لئے کہ مومن کی تو برابری ہی دنیا میں کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ تو اعلون ہے، سب سے بلند و بالاتر۔

مومنے بالائے ہر بالاترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

یہ تو تھا اس دنیا کے متعلق۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی تو حیاتِ انسانی کا اولین گہوارہ ہے، عہدِ طفولیت ہے۔ اس نے تو ابھی جوان ہونا ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے نزدیک یہ زندگی، بایں ہمہ رعنائی و زیبائی، اصل معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہی نہیں۔ "زندگی" تو اس کے بعد آنے والی ہے۔

وَمَا هَٰذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا لَهْوٌ وَلَعِبٌ ۚ وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۔ (۲۹/۶۴)

یہ زندگی تو محض کھیلنے کودنے کی زندگی ہے، بچپن کا زمانہ ہے، زندگی تو درحقیقت اس کے بعد کی منزل ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بتایا جائے کہ زندگی ایک مسلسل شے کا نام ہے، غیر منقطع، جہاں کوئی شے رُک جائے وہ اس کی موت ہوتی ہے۔

زندگانی از خرامِ پیہم است
برگ و سازِ ہستی موج از رم است

موجودہ دورِ حیات کے لہو و لعب ہونے کے متعلق ارشاد ہے:۔

زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما
فلک یک گردشِ پیمانۂ ما

حدیثِ سوز و سازِ ما دراز است
جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

ذرا اس "خاکِ درِ میخانۂ" اور "گردشِ یک پیمانہ" کے ٹکڑوں کو دیکھئے اور پھر سامنے لائیے آیۂ مقدسہ کے

اس حصہ کو کہ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ، اور اس ”دیباچہ افسانہ ما“ کے ساتھ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ کو۔ یہ موجودہ زندگی تو محض دیباچہ ہے۔ اصل کتاب تو ابھی شروع ہونیوالی ہے۔

ہر چند مضمون طویل ہو رہا ہے، لیکن جی نہیں چاہتا کہ ایک چیز سامنے آجائے اور اسے یونہی چھوڑ کر آگے گذر جائیں۔ ”حدیثِ سوز و ساز با دراز است“ کے لئے مجھے نظریۂ ارتقا بیان کرنا چاہئے، لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جس کا ضمناً لکھنا دشوار ہے۔ یہاں صرف حضرت علامہ کے اس مصرع کے متعلق کچھ اشارات ضروری ہیں۔ قرآن کریم میں ارتقاء کے ضمن میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک تدبیر (Plan) کرتا ہے۔ پھر اس تدبیر کو پختگی کی حد تک پہنچانے کے لئے اسے مختلف مراحل طے کراتا ہے۔ قطرہ کو گہر ہونے تک گونا گوں مقامات میں سے گذرنا ہے۔ ایک ایک مقام اور ایک ایک منزل کا نام یوم ہے (یعنی دن) لیکن یہ ایام ہمارے گردشِ لیل و نہار کے ایام نہیں، بلکہ ان کا طول ہمارے حساب سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۳۲)

وہ آسمان سے زمین کی طرف تدبیر امور کرتا ہے پھر وہ امر (پختگی اختیار کر کے) اس کی طرف بلند ہوتا ہے، ایک دن میں جس کی مقدار انسانوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے ہزار سال ہو سکتی ہے۔

دوسری جگہ ہے کہ بعض ایام پچاس پچاس ہزار سال کے بھی ہوتے ہیں۔ اسی کرۂ ارض کو دیکھئے۔ اپنی اصل سے الگ ہونے کے بعد (جس کا ذکر قرآنِ کریم میں موجود ہے) کتنے عرصۂ دراز میں اس قابل ہوئی ہوگی کہ اس پر کوئی ذی روح آباد ہو سکے۔ اسی طرح انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کتنی منازل طے کرنی ہوں گی اور اس میں کتنا وقت صرف ہوگا۔ اب پھر دیکھئے کہ

حدیثِ سوز و سازِ با دراز است

کس قدر سچی حقیقت ہے، اور کس قدر لطیف پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ اسی کو دوسری جگہ ذرا زیادہ شوخی سے لکھتے ہیں کہ

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں — کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

ہاں! تو کہنا یہ تھا کہ موت زندگی کو ختم کرنے والی شے نہیں، بلکہ یہ تو ایک نئی زندگی کا دروازہ ہے۔

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است — زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی عنوان پر دو ایک شعر اور بھی دیکھتے جائیے۔ کبھی شعروں کو دیکھئے اور کبھی اپنے قلب و دماغ کو کہ ایک ہی ثانیہ میں ان اشعار نے انھیں علم و ادراک کی کن بلندیوں اور کیف و نشاط کی کن جنتوں میں پہنچا دیا — ایسے ایسے شعر کہہ دینا درحقیقت فیضان ہے۔ اس کتاب مبین کی ضیا پاشیوں کا، جس کا دعویٰ ہے کہ آؤ

تمام نوعِ انسانی مل کر اس کی ایک سورت کی مثل کوئی چیز پیش کر کے دکھاؤ۔ ایسے شجرِ طیب کے برگ و بار بھی ایسے ہی ہونے چاہئیں۔ فرماتے ہیں۔

خاک با خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے — ذرہ ناچیز و تعمیر بیابانے نگر

پیامِ مشرق کے دو شعر ہیں۔

زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود — ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم — صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

اس آخری شعر کو ملاحظہ فرمایئے۔ شعلہ کی شکست اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ خاکستر بن کر رہ جائے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں پہلے سے بھی زیادہ تڑپ، چمک، حرارت پیدا ہو جائے۔ انسانی ہیولیٰ میں ہر چند "نورانیت" کا عنصر موجود ہے لیکن ابھی "مادیت" کا عنصر زیادہ غالب ہے۔ اس لئے حقائقِ اشیاء پر ظلمتوں کے پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس ہیولیٰ کی شکست اس لئے ہو گی کہ اس کے بعد شعلہ کی حرارتیں سمٹ کر شرر بن جائیں اور وہ اس آتشدانِ خاکی سے اڑ کر فضائے نور کی ان وسعتوں میں جا پہنچے جن کے لئے لاشرقیہ ولا غربیہ آیا ہے۔ جو مکانیت (Space) کے موجودہ تصورات کے دائرہ سے باہر ہیں۔ یعنی اِدھر سکراتِ موت کی جھکی آنکھ بند کرے اور اُدھر نورانی ملائکہ استقبال کے لئے آجائیں کہ حضور آیئے۔ تشریف لایئے۔ دیدہ و دل فرشِ راہ، یہ نورانی وادیاں، یہ دل و نگاہ کو سکون و اطمینان کی ٹھنڈک پہنچانے والی حسین جنتیں، آپ کے انتظار میں ہیں۔

اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶/۳۲)

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ملائکہ نہایت آسودگی کی حالت میں وفات دیتے ہیں۔ یہ کہتے ہوئے کہ تم پر سلامتی و رحمت ہو، آیئے جنت میں داخل ہو جایئے بوجہ ان اعمال کے جو تم نے کئے ہیں۔

اس آیت کو سامنے رکھئے اور پھر اس شعر کو پڑھئے کہ

شعلہ بودیم و شکستیم و شرر گردیدیم — صاحبِ ذوق و تمنا و نظر گردیدیم

پھر جنت کے متعلق جو اس آیت میں اور دیگر متعدد آیات میں آیا ہے کہ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ یعنی جنت اعمال کی جزا ہے اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ

آں بہشتے کہ خدائے بتو بخشد ہمہ ہیچ — تا جزائے عملِ تست جہاں چیزے ہست

زندگی کے تسلسل کے متعلق غزل کا بھی ایک شعر سنئے۔ اور دیکھئے کہ غزل کی رنگینی باقی رکھتے ہوئے بھی حقائق کیسے بیان کئے جا سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

پریشاں ہو کے میری خاک آخر دل نہ بن جائے — جو مشکل ہے یارب پھر وہی مشکل نہ بن جائے

اس غزل کا دوسرا شعر ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اس شعر میں انسان (آدم) کے ہبوط و صعود کی حقیقت کس قدر دلآویز پیرایہ میں بیان کی گئی ہے۔ تخلیقِ آدم کا قصہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں، اس کے بعد ہبوطِ آدم کا ذکر ہے، ہبوط کے معنی نیچے گرنے کے ہیں، آدم کے جنت سے نکلنے کے لئے قرآن کریم نے خروج (نکلنا) کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ ہبوط (نیچے گرنے) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس ہبوط کی رعایت سے آدم کو ٹوٹا ہوا تارہ کہنا کس قدر موزوں ہے، کہ تارہ جب ٹوٹتا ہے تو نیچے گرتا ہے۔ پھر حضرت آدمؑ نے اپنے ہبوط کا جو اثر بیان کیا تھا وہ یہ تھا کہ اے بارِ الٰہ! اگر ہماری توبہ قبول نہ ہوئی، اگر ہمیں اپنی حالت میں نہ پہنچایا گیا تو لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے، ٹوٹا پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ اس ہبوط کے بعد ان تمام ارتقائی منازل کو طے کر کے پھر ایسا عروج حاصل کرنا کہ تارہ مہِ کامل بن جائے؛ اس کی عظمتیں اور رفعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جائیں۔ یہ ہے وہ راز جو ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل تھا، اور جس کی وجہ سے یہ انجم یوں سہمے جاتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ۔ (وَالتِّيْن)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ہیئت میں پیدا کیا، پھر اسے (اس کے اعمال کی بدولت) نچلے سے نچلے درجہ میں لوٹا دیا، مگر سوائے ان کے جنھوں نے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کئے۔ پس ان کے لئے غیر منقطع اجر ہے۔

انسان میں ایمان و عملِ صالح پیدا ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ یہ شہباز کن بلندیوں پر اڑتا ہے، ایسی فضاؤں میں جو حدود و ناآشنا ہیں (غیر ممنون) اسی پرواز کی پہلی منزل ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں۔

برخیز کہ آدم را ہنگام نمود آمد این مشت غبارے را انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہی فرق ہے یورپ کے نظریۂ عروج اور ایک مسلم کے نظریۂ عروج میں۔ یورپ کا مادہ پرست، انسان کی پرواز اس دنیا، یا زیادہ سے زیادہ کسی قریبی ستارے مثلاً مریخ وغیرہ تک سمجھتا ہے، اور وہ بھی محض جسمانی پرواز، جو بھی مادی پرواز بھی ہے، اور اسی زندگی سے متعلق ہے لیکن قرآن کریم انسان کو بہت اونچا لے جاتا ہے۔ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔ ایسے مبارک درخت کی طرح جس کی جڑیں مضبوط ہوں اور جس کی شاخیں آسمان کے اوپر ہوں، اسلئے حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن قدم اٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اس چیز کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ارتقائی منازل کو "عشق کے امتحاں" کہنا خشک فلسفہ کو کس قدر شیریں بنا دیا ہے۔ دوسرے شعر میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ یہ بلندیوں کی فضائیں جنہیں قرآنی اصطلاح میں سمٰوات کہا جاتا ہے، آبادی سے خالی نہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ۔ (۴۲/۲۹)

اللہ کی نشانیوں میں سے یہ (بھی) ہے کہ اس نے زمین و آسمان پستیوں اور بلندیوں کو پیدا کیا۔ اور ان دونوں میں جو جاندار پھیلا دیئے وہ بھی۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں ان آباد فضاؤں کو کارواں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۔ اور ہم نے تمہارے اوپر سات (یا متعدد) رہگذر بنائے، یہ رہگذر کاروانوں ہی کیلئے تو ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کارواں در کارواں ہجوم کون کون سی ارتقائی منازل طے کرتے پھر رہے ہیں۔ عشق کی کون کون سی وادیوں میں سرگرداں ہیں پھر چونکہ یہ تمام آبادیاں ایک جوئے رواں کی طرح ہر وقت مصروفِ خرام ہیں، قطع منازل کر رہی ہیں، اس لئے ان کو کارواں کہنا ایسا حسین انداز ہے جس کی داد غالب ہی دے سکتا تھا۔

شعر جذبات کے اظہار کا بہترین ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ انہی جذبات سے اس میں دل کشی اور سوز و گداز پیدا ہوتا ہے لیکن جب شعر میں حقائق بیان کئے جائیں یا اس کا انداز مصلحانہ، اور پیامی ہو جائے تو پھر اس میں بالعموم شعریت باقی نہیں رہتی۔ پھر یا تو وہ شعر اس انداز کا ہو جاتا ہے کہ ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ہنس کر گذار یا اسے رو کر گذار دے

یا اس انداز کا۔

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ ہے بُرا وہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

اور ایک ذوقؔ ہی کیا موقوف ہے، بڑے بڑے عمدہ شعر کہنے والے جب تبیانِ حقائق یا مصلحانہ انداز انداز میں کچھ کہتے ہیں تو شعر بے جان ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت علامہ ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ حقائق اور حقائق بھی اس درجہ دقیق بیان کئے جاتے ہیں اور شعر کے حسن میں بھی کوئی کمی نہیں آتی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

ستاروں کی دنیا کے متعلق زبورِ عجم میں فرماتے ہیں۔

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بوداست

ہاں تو زندگی ایک مسلسل خرام کا نام ہے، چلتے جانا، بڑھتے جانا اور بڑھتے جانا، بڑھتے ہی چلے جانا کہ

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے مقام سمجھا جاتا ہے وہ مقام نہیں۔ جسے منزل کہا جاتا ہے وہ منزل نہیں، یونہی ذرا ستانے، دم لینے کیلئے، گھنے درختوں کا سایہ ہے، کارواں کے دوپہر کاٹنے کے لئے نخلستان ہے۔ وہ جنت کہ جسے بالعموم منزل مقصود سمجھا جاتا ہے، راستہ کی خوشگوار وادی ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی اہلِ جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ

يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔ (۵۷)

ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں کی طرف چلتا ہوگا۔

یہ نور پیشانی کی روشنی، یہ سرچ لائٹ، بالآخر اگلی منزل کا راستہ دکھانے کیلئے ہی تو ہوگی۔ وہ راستہ جس کے متعلق ارشاد ہے کہ جنت میں پہنچ کر بھی وَهُدُوْا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ۔ ان کی ایک پسندیدہ راستہ کی طرف رہنمائی کی جائیگی۔ (۲۲) دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا تھی، ایک سیدھے راستہ پر چلنے کی، وہاں ایک پسندیدہ راستے پر چلائے جائیں گے۔ اس لئے جنت مقام نہیں، راہ گذر ہے۔ وہاں سے بھی انسان کو آگے بڑھ جانا ہے۔

اگر عنانِ تو جبریل و حور می گیرند کرشمہ بر دلِ شاں ریز و دلبرانہ گذر

کہ ملائکہ کا تو یہ ٹھیرا مسجود، اُن کا مقام اس کا مقام کس طرح ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ شکار ہے جس کا اٹھانا بھی تضیعِ اوقات ہے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

لیکن بایں ہمہ انتہائے لامکان؟ نہیں، ہر ایک مقام سے آگے ہی سہی۔ لیکن مقام اس کا ضرور ہے۔ وہ مقام کیا ہے؟ وہ منزلِ مقصود کون سی ہے؟ یہ راز ہے جسے کھول کر بیان نہیں کیا گیا، نہ ہی اس کی آج ضرورت تھی۔ آج تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی کے بعد اگلی منزل کونسی ہے؟ سو اس کی تفصیل شرح و بسط کی قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ اس منتہٰی کے متعلق تو سر دست اتنا ہی کہا گیا ہے کہ وَاِلٰى رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا۔ اس کا منتہٰی تیرے رب تک ہے۔

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من مرشدِ رومی کہ گفت منزلِ ما کبریاست

لیکن یہاں پہنچ کر حضرت علامہ واصل بالحق کے عقیدہ کا اتباع نہیں کرتے کہ قرآنِ کریم کے رو سے انسان کے خدائے واحد کی ذات میں جذب ہو جانے کے عقیدہ کی سند نہیں ملتی۔ لیکن حضرت علامہ اس عقیدہ سے کے اختلاف میں بھی ایک شانِ انفرادیت پیدا کر لیتے ہیں اور اسے انسان کی خودی کے محکم بالذات ہونے کے منافی سمجھتے ہیں

کہ وہ کسی کی ذات میں گم ہو جائے۔ ان کے نزدیک عشرتِ قطرہ دریا میں فنا ہو جانا نہیں، بلکہ تہِ دریا گہر بن کر بیٹھ جانا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا او بیند و او را تو بینی

بخود محکم گذار اندر حضورش مشو ناپید اندر بحر نورش

"ترا او بیند" تو ہر وقت کا معاملہ ہے، وہ کونسا لمحہ ہے جب خدا انسان کو نہیں دیکھتا۔ لیکن "و او را تو بینی" کا مقام اس منزل سے آگے آتا ہے۔ موجودہ مقام میں تو ایک اولوالعزم پیغمبر نے جب یہ آرزو کی، کہ رب ارنی، تو جواب ملا کہ لن ترانی (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) لیکن اس سے اگلی منزل میں مومنین کی یہ کیفیت ہوگی کہ

وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

بہت سے چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اب خدا بندے کو دیکھ رہا ہے۔ اس وقت بندہ بھی خدا کو دیکھے گا کہ

عبد و مولا در کمینِ یک دگر ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر

زندگی ہر جا کہ باشد جستجو ست حل نشد این نکتہ من صیدم کہ اوست

اگر ایک طرف انسان کی تڑپ اور تبسس کا یہ عالم ہے کہ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ۔ اپنے رب کی طرف رواں دواں جائیں گے، تو دوسری طرف یہ کیفیت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ وَأَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُورِ رَبِّهَا۔ زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی۔ وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا۔ اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار زمین پر آئیں گے کہ

ہر دو بے تاب اند از ذوقِ نظر

لیکن یہ تمام مراحل طے کس طرح ہوں گے؟ یہ "محکم خودی" حاصل کیسے ہوگی!! یہ اس دنیا میں أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ ہونا یعنی ایسا سخت ہو جانا کہ کوئی اسے ہضم نہ کر سکے، کوئی اپنے اندر جذب نہ کر سکے، یہ کیسے ہوگا!!! اس خاک کے تودے میں فولادی جوہر کیونکر پیدا ہوں گے! یہ نازک سا شیشہ اپنے اندر ایسی سختی کیسے پیدا کرے گا کہ اس کا "زجاج حریف سنگ" ہو جائے۔ اس کے لئے رموز و اسرار میں پورا لائحہ عمل مرتب کر کے دیدیا گیا ہے، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، لیکن اس سب کا ماحصل ایک نکتہ ہے اور یہی نکتہ در اصل کلامِ اقبال کا محور ہے، مرکز ہے، محیط ہے، سب کچھ ہے یہ نکتہ، محمد رسول اللہ فرماتے ہیں۔

ترا جوہر ز نوری پاک ہے تو فروغ دیدۂ افلاک ہے تو

ترے صید زبوں افرشتہ و حور کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

بس یہ ہے رازِ ایک مومن کی پختگی کا، اس کی خودی کے استحکام کا کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو۔ تو ان مقدس ہاتھوں کا پروردہ ہے جن کی شان میں آیا ہے کہ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ۔ (الفتح) تو تو اس ذاتِ گرامی کا شاہین

جو ہادئ سبل، ختم رسل، مولائے کل ہے، جو معراجِ انسانیت کا مظہرِ کامل ہے۔ جب تو ایسی رفیع الشان بارگاہ کا شاہین ہے تو تیرے عرش آشیاں ہونے میں کیا کلام ہے۔ لہٰذا یہ تمام فضائیں اور فضاؤں کی پہنائیاں یہ سب پستیاں اور تمام بلندیاں، یہ ارض و سماوات، یہ تمام کائنات اور اس کی فیوذ ناآشنا وسعتیں، اس شاہین شہ لولاک کے بازوؤں کے نیچے کیوں نہ ہوں، اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت عشق کے مرتبہ تک نہ پہنچ چکی ہو۔ کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے اور یہ اطاعت قرآن کی اطاعت سے میسر ہوتی ہے کہ حضورؐ قرآن ہی کی اطاعت سکھانے کو تشریف لائے تھے۔

> قسم ہے تیرے پروردگار کی، ان میں سے کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے ان تمام معاملات میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں، اے رسول، تمہیں اپنا حکم تسلیم نہ کر لیں پھر تمہارے فیصلوں پر دل میں بھی کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہ کریں۔ بلکہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں۔ (۴/۶۵)

اس نکتے کے اندر امت کی مرکزیت، امیر کی اطاعت[1]، وحدتِ افکار و عمل اور ان کے جیتے جاگتے نتائج، یعنی تمکن فی الارض، شان و شوکت، حکومت و سطوت، زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا قیام، سرفرازیاں اور سربلندیاں، کامیابیاں اور کامرانیاں، اور اس کے بعد حیاتِ اخروی میں، بعد کی منزل میں، آگے بڑھنے کی قوتیں، مدارجِ عالیہ، یہ سب کچھ اس کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے ضمناً اس بحث کو یہاں چھیڑ دینا پڑا، ورنہ یہ تو وہ عنوان ہے جس پر کلامِ اقبال سے ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اقبال کی تمام شاعری اور شاعری کا تمام سوز و گداز رہینِ کرم ہے۔ محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا، جذبۂ اطاعت کا۔ اسی ذاتِ گرامی کی شعلہ ریز محبت ہے، جس نے اقبال کو اقبالؔ بنا دیا، ورنہ یہ بھی کہیں "میرِ مشاعرہ" ہوا کرتے۔ جذبۂ اطاعتِ رسولؐ نے (جسے وہ عشق کہتے ہیں) اقبال کو اس انداز سے گداز کر رکھا ہے کہ اس کے بربطِ ہستی کے کسی تار کو چھیڑیے، اس میں سے نغمہ وہی پیدا ہوتا ہے۔ اسی چیز نے ان کے سامنے قرآنی حقائق کو بے نقاب کیا اور قرآنی حقائق نے ان کے کلام میں دمِ مسیحا اور ضربِ کلیم کے اعجاز پیدا کر دیئے۔ فطرت کی کرم گستری نے وہ دماغ عطا کیا تھا جو یکسر علم و حکمت تھا، محبتِ رسولؐ کی موہبتِ عظمیٰ سے وہ قلبِ منور مل گیا جسے صہبائے ایمان کا مقدس آبگینہ کہنا چاہیئے، ان دونوں کے امتزاج سے وہ نگاہ پیدا ہوئی، جو اشیاء کی حقیقت کو بے نقاب دیکھ لے، جو گل و خار کے نظر فریب امتیاز سے ہٹ کر شاخِ گل کے اندر جا کر مشاہدہ کرے؛ "درونِ او نہ گل باشد نہ خار است"۔ اس نگہِ حقیقت شناس کا نام ہے اقبالؔ یعنی قلب و دماغ کا مجموعہ۔ ایمان و حکمت کا نشرہ۔ زیرکی و عشق کا عصارہ، اوستؔ و بوعلیؔ کا مرکب مجسمہ، رومیؔ و رازیؔ کا مشترکہ شاہکار۔ مشرق و مغرب کا مقامِ اتصال۔

---

[1] نظامِ اسلامی کی رو سے کس طرح امامِ متفق علیہ (یعنی مرکزِ ملت) کی اطاعت، اطاعتِ خدا و رسول کے مرادف ہو جاتی ہے قرآن کریم میں بصراحت اس کی تشریح موجود ہے۔ اسی جذبۂ اطاعت کے اندر قوموں کی زندگی کا راز ہے اور اس کو بھلا دینے سے مسلمانوں کی آج یہ حالت ہو رہی ہے۔ اطاعت جب خوف و ترہیب سے بلند اور مزد و معاوضہ سے بے نیاز ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے۔

غریباں را زیرکی سازِ حیات شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ عشق را با زیرکی آمیزدہ

اور یہی وہ امتزاجی کیفیت ہے جو قرآنِ کریم ایک مومن کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مظاہرِ فطرت کی گوناگوں نیرنگیوں کے بعد فرمایا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ

بیشک (ان مظاہرِ فطرت) کے اندر صاحبانِ عقل و خرد کیلئے آیات ہیں یعنی وہ لوگ جو اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔

یہ عقل و ہوش کے ساتھ خدا کو یاد کرنے والے وہ مومن ہیں جنہیں نوعِ انسانی کے لئے نمونہ بنایا گیا ہے۔

اور پھر سحابِ فطرت کا کرم بالائے کرم کہ اس نگہِ حقیقت بین کو اظہارِ مشاہدات کے لئے ذریعہ بھی ایسا حسین و دلکش عطا کر دیا کہ جو دیکھے کھنچا چلا آئے ——— بشرطیکہ وہ کہیں سے بوجہل و بولہب کی سی آنکھیں نہ مانگ لایا ہو۔ اور پھر تماشا یہ کہ یہ ملکوتی کام لیا اس شاعری سے جس کے علمبردار ابھی تک اس "تحقیق انیق" سے ہی فارغ نہیں ہو سکے کہ بلبل مذکر ہے یا مونث۔ سچ ہے جب خدا چاہے تو ایک خشک لکڑی سے وہ کام لے لے کہ وہ کذب و باطل کے بڑے بڑے اژدہوں کو نگل جائے۔ یہ اور بات ہے کہ قومِ اقبال کو بھی ایسی ہی ملی ہو جو قومِ موسیٰ کی طرح کہہ دے کہ اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ۔ جاؤ اور تیرا رب لڑو جا کر ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ جب فتح ہو جائے تو آواز دیدینا۔ بایں ہمہ یقین ملئے جس طرح قرآنِ کریم نے عرب کی شاعری کے دورِ جاہلیت کو ختم کر کے اسی قوم سے ایک ایسا خمیر تیار کر دیا تھا کہ وہ جس آٹے میں جا کر ملے، اس میں بھی خمیر کی کیفیت پیدا کر دے۔ وہ قوم کہ جسے چشمِ فلک نے ایک بار دیکھا، اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ سرگرداں ہے۔ اقبال نے بھی مشکوٰۃ قرآن کی روشنی میں عجمی شاعری کے "دورِ جاہلیت" کو ختم کر کے ان کے اعصاب میں ایسا خون دوڑا دیا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب یہ زمین بدل جائے گی، یہ آسمان بدل جائے گا اور مسلمان پھر یہ کہنے کے قابل ہو جائے گا کہ

زمیں از گردشِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے

نقد و نظر

(۲) انتخاب دساتیرِ عالم | پاکستان کی مجلس دستور ساز کی طرف سے تین جلدوں میں دنیا کی مختلف حکومتوں کے دساتیر (Constitutions) کا انتخاب شائع ہوا ہے جس کے مرتب، مجلس دستور ساز کے سکرٹری، محمد بشیر احمد صاحب ہیں۔ جلد اول مشرقی ممالک کے دساتیر کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ اس وقت ان دساتیر یا ان کی ترتیب و تدوین پر تبصرہ مقصود نہیں بلکہ صرف ایک اقتباس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ ان انتخابات کے مرتب یعنی مجلس آئین ساز کے سکرٹری صاحب کی اپنی نگاہ کی کیا کیفیت ہے۔ ترکی کے آئین کے متعلق لکھا ہے[۱] کہ ترکی ایک لادینی مملکت ...... (Secula State) ہے اور یہی اس کی ترقی کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ

> (اسلام میں) مذہب اور سیاست کا امتزاج بعد کی چیز ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب، جو خود شریعت کا سخت پابند اور دینیات اور سیاسیات کا عالم تھا، یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ مذہب کو امور دنیا کی سے کچھ تعلق نہیں۔ "امور دنیا را از مذہب چہ نسبت؟"

اس اقتباس سے حسب ذیل نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

(۱) خود سکرٹری صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ چیزیں ہیں؛ ان دونوں کا اشتراک ایک بدعت ہے جو بعد میں وضع کی گئی ہے۔

(۲) اس عقیدہ کی سند یہ ہے کہ اورنگ زیب جیسے پابند شریعت اور عالم دین و سیاست کا بھی یہی عقیدہ تھا۔

(۳) اورنگ زیب کے اس مسلک کی سند یہ ہے کہ اس نے خود لکھا ہے کہ "امور دنیا را از مذہب چہ نسبت"۔

شق اول (یعنی خود سکرٹری صاحب کے عقیدہ کے متعلق) ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اس کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی کے سکرٹری ہیں جس نے ابھی کل ہی "قرارداد مقاصد" میں اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ اسلام میں مذہب

---

[۱] ان تمہیدات میں یہ صراحت نہیں کہ ان کا لکھنے والا کون ہے لیکن کتاب کے مرتب سکرٹری صاحب ہیں، اس لئے جہاں کسی اور نام کی صراحت نہیں یہ بیانات انہیں کے سمجھے جائیں گے۔

اور سیاست الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے وہ اسلام سے ناواقف ہے۔

شق دوم کے متعلق صرف اتنا عرض ہے کہ اسلام میں سند صرف خدا کا قول ہے کسی اورنگ زیب اور شاہ جہاں کا نہیں۔

اور شق سوم کے متعلق گذارش ہے کہ اورنگ زیب کے اس قول سے یہ نتیجہ اخذ کرنا اس بچارے کے خلاف بہت بڑی بہتان تراشی ہے۔ اس نے "امور دنیا را از مذہب چہ نسبت" کس موقعہ پر کہا تھا اور اس سے کا مفہوم کیا تھا، اسے خود سکرٹری صاحب چند صفحات پہلے ان الفاظ میں لکھ چکے ہیں۔

> مورخین کے ایک گروہ نے کوشش کی ہے کہ (مذہبی رواداری کے متعلق) اورنگ زیب کے مسلک کی غلط ترین تصویر پیش کی جائے۔ اس کے خلاف سب سے بڑی شہادت خود اورنگ زیب کا ایک حکم ہے۔ ایک شخص تھا محمد امین۔ وہ پہلے ہندو تھا۔ بعد میں مسلمان ہوگیا۔ مسلمان ہونے کے بعد اس نے درخواست دی کہ (اس کے اسلام لانے کے صلہ میں) اسے ترقی مدارج یا کوئی عہدہ ملنا چاہئے۔ اس پر اورنگ زیب نے لکھا کہ
>
> امور دنیا را از مذہب چہ نسبت (ص۵)

یہ واقعہ خود سکرٹری صاحب نے درج فرمایا ہے۔ اب آپ خود غور فرمائیے کہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اورنگ زیب کا یہ عقیدہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے کچھ تعلق نہیں، نہ صرف جہالت ہے بلکہ علمی غیر دیانتداری بھی۔ لیکن اس جہالت کا مظاہرہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے بعد سکرٹری صاحب اور بھی آگے بڑھتے ہیں اور ارشاد فرماتے ہیں۔

> علامہ اقبال، ہمارے قومی شاعر بھی اسلام کو ایک جامد مذہب تصور نہیں کرتے اور وہ اس مسلک کے خلاف تھے کہ اسلام کو ایسا منقفل کر دیا جائے کہ مغربی اثرات اس تک قطعاً نہ پہنچ سکیں۔

وہ سیاسی اور معاشرتی جمود کے یکسر خلاف ہیں اور فرماتے ہیں کہ

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا سے ہی گوہر کی سیرابی [1]

اس اقتباس سے حسب ذیل نتائج مستخرج ہوتے ہیں۔

(۱) سلسلہ بیان یوں چلا آرہا تھا کہ اسلام میں مذہب کو سیاست سے الگ رکھنا چاہئے۔ چنانچہ اس کے لئے سکرٹری صاحب نے اپنے عقیدہ کی سند میں اورنگ زیب کا قول نقل فرمایا تھا۔ اس سلسلہ میں اقبال کے ذکر سے لامحالہ یہی مترشح ہوتا ہے کہ سکرٹری صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقبال بھی یہی عقیدہ رکھتا تھا۔ لیکن اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اسے پہلے دعوے سے کچھ تعلق ہی نہیں، یہ بے ربطی مضمون ذہنی انتشار کی دلیل ہے۔

(۲) اقبال کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صرف اس امر کی تائید کرتا ہے کہ اقبال جمود و تعطل کے

بجائے اسلام کو ایک نامی تحریک سمجھتے تھے اور مغرب نے طبیعاتی علوم و فنون میں جسقدر ترقی کی ہے اس سے متمتع ہونا ضروری قرار دیتے تھے، یہ بالکل درست ہے۔

(۴) لیکن اس کی سند میں اقبال کا جو شعر درج کیا گیا ہے اسے اس دعوے سے کچھ تعلق ہی نہیں جس شخص نے اقبال کی بانگِ درا میں ان کی نظم طلوعِ اسلام کا خود مطالعہ کیا ہے یا صرف اس شعر ہی کو بامعانی نظر دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس شعر کے کیا معنی ہیں اور ہمارے فاضل سکرٹری صاحب نے اسے کیا سمجھا ہے!

یہ ہے نمونہ ہماری مجلس آئین ساز کے سکرٹری صاحب کے (۱) اسلام کے بنیادی اصول کے متعلق ذاتی عقیدہ کا (۲) واقعات سے استنباطِ نتائج کی اہلیت کا (۳) ایک مسلک کو کسی کی طرف منسوب کرنے کی ذہنی دیانت کا۔ اور (۴) ان کی اقبال فہمی کا۔

اللہ رحم کرے اس انجمن پر جس کے سکرٹری کا یہ عالم ہو!

خود غلط، مضمون غلط، املا غلط، انشا غلط

Constitution of Medicine
Lt. Col. M. H. Shah

متعصبانہ تنگ نظری، جس سے انسان بلا علم و دلیل اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ حقیقت صرف اس کے پاس ہے اور کسی کے نہیں، یوں تو زندگی کے ہر شعبہ میں جہالت اور نقصان کا موجب ہے۔ لیکن ان امور میں جن کا تعلق انسانی فلاح و بہبود سے ہے اس قسم کا مسلک خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے انسانیت ان فوائد و منافع سے محروم رہ جاتی ہے جو آزادانہ تحقیق و اجتہاد کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ جن امور کا تعلق انسانی بہبود اور خوشحالی سے ہے ان میں علم طب کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہمارے ہاں ایک تو طب قدیم ہے جسے طبِ یونانی کہتے ہیں اور دوسری طب مغرب، جو ایلوپیتھک طریق علاج کے نام سے متعارف ہے (ہومیوپیتھک طریق علاج بھی قریب ایک سو سال سے رائج ہے اور آج کل اس کا چرچا عام ہو رہا ہے)۔ لیکن اسی تنگ نظری کی بنا پر جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، طب قدیم اور جدید میں اس قسم کی منافرت چلی آرہی ہے کہ ایک کو دوسرے میں کوئی خوبی ہی نظر نہیں آتی۔ ہمارے لئے یہ امر وجہ اطمینان ہے کہ دارالسلطنت پاکستان کے ممتاز ترین ڈاکٹر کرنل شاہ (چیف میڈیکل آفیسر، جناح سنٹرل ہسپتال، کراچی) نے اس تنگ نظرانہ مسلک سے بہت بلند ہو کر محققانہ انداز میں طب قدیم کے اصولوں کا مطالعہ کیا ہے اور وہ شیخ الطب حکیم بو علی سینا کے قانون پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ طب قدیم کے اصولوں کی روشنی میں طب مغرب میں کافی اصلاح و ترمیم کی جا سکتی ہے جس سے وہ ہمارے (بالخصوص پاکستان کے) مقتضیات کو پورا کرنے کے قابل بن سکتی ہے۔ زیرِ نظر پمفلٹ سے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ کرنل شاہ مشرقی اور مغربی طب اور فلسفہ پر بالغانہ نگاہ رکھتے ہیں اور

اپنے فن کو محض نظری مباحث میں الجھائے رکھنے کے بجائے، اس کی عملی افادیت کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ ہم کرنل شاہ کو ان کی وسعتِ قلب اور بلندی نگاہ پر مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ امید ہے وہ اپنی ان محققانہ کوششوں کو جاری رکھیں گے کہ علم اسی طرح سے بڑھتا ہے۔

Whither Pakistan
By
Z. A. Suleri

شائع کردہ۔ ایسٹرن پبلشرز۔ ۶۲ وارڈک اسکوائر۔ لنڈن۔
صفحات ۹۶۔ قیمت پانچ شلنگ۔

ضیاء الدین احمد سلہری ان نوجوانوں میں سے ہیں جنھوں نے دیوانگیٔ انقلاب میں پیرہنِ اصول و اعتدال کا ہوش گم نہیں ہونے دیا۔ اور یہ اس لئے کہ ان کی فکر کا پس منظر خدا کا وہ ابدی قانون ہے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ زیرِ نظر کتابچہ میں سلہری صاحب نے اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ وہ کونسے فطری تقاضے تھے جن کی بنا پر مسلمانانِ ہندوستان اپنی جداگانہ مملکت کی تشکیل کے لئے مصروفِ جدوجہد تھے اور اب قیامِ پاکستان کے بعد، وہ کونسا نظام اپنے سامنے رکھتے ہیں جس میں ان کی ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کی نجات و سعادت کا راز مضمر ہے۔ یہ نظام وہی ہے جو انھیں قرآن نے عطا کیا ہے اور جو انسانیت کو ان مصائب سے نجات دیتا ہے جن کے حل کی تلاش میں آج دنیائے مغرب اس طرح مضطرب و بیقرار اور اس کے ساتھ ہی خاسر و ناکام پھر رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ سلہری صاحب کی یہ کوشش بھی ان کی سابقہ کتاب "مائی لیڈر" کی طرح بہت کامیاب رہیگی۔

آئین و ضوابط مرکزیہ مجلس اقبالؒ

مسجد شاہ چراغ۔ لاہور

علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد سینکڑوں انجمنیں اس مقصد کے لئے وجود کو شش ہوئیں کہ ان کے پیغام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بن سکیں۔ لیکن ان میں شاید ہی کوئی ایسی ہو جسے کامیاب کہا جا سکے۔ حضرت علامہ کے دورانِ حیات میں، چند باہمت نوجوانوں نے مسجد شاہ چراغ میں ایک مختصر سی مجلس کی تشکیل کی تھی جس کے سر سب سے پہلے یوم اقبال (منعقدہ جنوری ۱۹۳۸ء) کا سہرا ہے۔ یہ مجلس نہایت خاموشی سے اپنے کام میں مصروف رہی ہے اور اب انھوں نے اپنے آئین و ضوابط میں ترمیم کر کے اپنے حلقۂ سعی و عمل کو وسیع تر کرنے کا عزم کیا ہے۔ اللہ ان کے ارادوں میں برکات عطا فرمائے اور ان کی تگ و تاز کو اس کے پیغامِ حیات آفریں کی صحیح نشر و اشاعت کا ذریعہ بنائے جس نے اس دورِ خدا فراموشی میں انسانیت کو اس کی بھولی ہوئی منزل کا نشان دیا ہے۔

اللہ شوق دے تو کتابیں پڑھا کرو

تصانیف رئیس احمد جعفری

		قیمت
حیات محمد علی جناح	سوانح	۷/-/-
ہاشمی	ناول	۳/۸/-
اختر	"	۳/-/-
اقبال امام ادب	سوانح	۱/۸/-

تصانیف رشید اختر ندوی

کانٹوں کی سیج	ناول	۳/۸/-
نشان راہ		۳/۸/-
تلخیاں		۳/۸/-
تشنگی		۴/۸/-
نسیم		۳/۸/-
بادہ باران		۳/-/-
پندرہ اگست		۳/۸/-
نسرین		۲/-/-
ایک پہیلی		۵/-/-
گل رخ		۲/۸/-

نشیمن		ناول	۳/۸/-
وادیاں	ڈرامے	ساغر نظامی	۵/۸/-
جستجو	افسانے	"	۵/-/-
موج و ساحل		غزلیں	۲/-/-
رنگ محل	"	"	۳/-/-
کالی گھٹائیں	ناول	احمد شجاع پاشا	۵/-/-
فلورا	"	"	۲/۸/-
عروج و زوال	مضطر ہاشمی	ناول	۳/-/-
بیسوا	مظفر حسین شمیم	"	۱/۸/-
حدیث دیگراں۔	خمار بارہ بنکوی	غزلیں	۲/-/-
جذبات ماہر	ماہر القادری	غزلیں	۲/-/-
حسن و شباب	"	افسانے	۲/-/-
پیمانے	"	"	۲/-/-
مقالات ماجد	عبدالماجد دریابادی	تنقید	۳/۸/-
مثنوی بحر المحبت	"	مثنوی	۱/-/-
آثار غالب۔	شیخ محمد اکرام	تنقید	۳/۸/-
شبلی نامہ	"	سوانح	۴/-/-

نام کتاب			قیمت
روح کوثر	شیخ محمد اکرام	سوانح	۴/-/-

تصانیف جوش ملیح آبادی

نام کتاب			قیمت
شعلہ و شبنم			۵/-/-
سنبل و سلاسل			۴/۸/-
سیف و سبو			۲/-/-
عرش و فرش			۴/-/-
جنون حکمت			۳/-/-
نقش و نگار			۳/۸/-
روح ادب			۲/-/-
حرف و حکایت			۳/-/-
آیات نغمات			۳/۸/-
شاعر کی راتیں			۱/۸/-
حسین انقلاب			۱/-/-
عشقیہ کلام مختلف شعرا			-/۱۲/-
عشق و محبت	..	..	۲/۸/-
مرقع جذبات	..	..	۲/۸/-
دامن گل چیں	..	مزاح	۱/۱۲/-
جھلکیاں	یوسف بخاری		۲/-/-
موج کوثر	کوثر چاندپوری	افسانے	۲/-/-

نام کتاب		قیمت
دو قرآن	غلام جیلانی	۳/۸/-
قرآن پاک کیا ہے		۱/۸/-
رسول پاک کون تھے		۱/۸/-
اسلام کے مشہور سپہ سالار		
اول		۲/۸/-
دوم		۲/۸/-
اسلام اور سود	ڈاکٹر انور اقبال	۳/۸/-

شاہ نامہ اسلام حفیظ جالندھری

نام کتاب		قیمت
اول		۶/-/-
دوم		۶/-/-
سوم		۶/-/-
چہارم		۶/-/-
شیریں		۵/-/-
نغمہ زار		۳/۴/-
سوز و ساز		۳/۴/-
چمنستان	مولانا ظفر علی	۵/-/-
نگارستان		۴/۸/-

نام کتاب		قیمت
تصانیف علامہ اقبالؒ		
بانگ درا		۴/۸/-
ضرب کلیم		۳/۸/-
بال جبریل		۴/-/-
ارمغان حجاز		۴/۸/-
روح اقبال		
اقبال پر ایک نظر		
مقام اقبال		
مکاتیب اقبال		
عارف بٹالوی		
امیر پاکستان		۲/۸/-
ٹیڑھی لکیر	عصمت چغتائی	۶/۸/-
چوٹیں		۲/۸/-
کلیاں		
ضدی		
قرآن مجید	(پانچ سیپارے) ترجمہ سندھی	۳/-/-
اسلامی باتیں	علامہ پرویز	-/۸/-
اسلامی نظام		-/۱۴/-
مسلم لیگ کو ختم کردو		-/۱۴/-
شاہین	نسیم حجازی	۶/۸/-
محمد بن قاسم	"	۵/-/-
داستان مجاہد	"	۴/-/-
زندگی	چودھری عبدالحق	۲/-/-
عشرت	عارف بٹالوی	۲/۸/-
ماں		۶/-/-
تبلے	احمد ندیم قاسمی	
گرداب		۳/۶/-
آس پاس		۲/۱۲/-
سیلاب		۳/۸/-
آنچل		۲/۸/-
اسلام کے حیرت انگیز لمحات		
تاریخ اسلام	شوق امرتسری	۱۰/-/-
ترجمہ سپرٹ آف اسلام	امیر علی	۳/۸/-
نظام نو	عبدالواحد خاں	۲/۸/-
ترجمان القرآن	مولانا آزاد	
جلد اول		۱۴/-/-
دوم		۳۱/-/-
تجرید بخاری		۱۲/-/-
رحمت اللعالمین	مولانا سید سلیمان ندوی	
اول		۷/-/-
دوم		۷/-/-
سوم		۷/-/-
تصانیف علامہ پرویز		
معارف القرآن		"
جلد اول		۱۰/-/-

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
معارف القرآن　جلد دوم	۱۰/-/-	حریف آدم　ناصر ایم۔ اے	۱/۴/-
〃　جلد سوم	۱۵/-/-	تلاش مسرت　〃	۲/-/-
		آخری تمنا　انوار صدیقی	۲/۸/-
حکومت الٰہیہ	۲/۱۲/-	دو آنسو　〃	۳/-/-
سودائی　رشید اختر ندوی		علامہ راشد الخیری	
		طوفان اشک	
کارٹون　شوکت تھانوی	۳/۸/-	حور اور انسان	
انشاء اللہ　〃	۳/-/-	میلے میں میلا	
کتیا	۳/۸/-	عروس کربلا	
وغیرہ وغیرہ	۳/۸/-	نشیب و فراز	
سودیشی ریل	۳/۸/-	سودائے نقد	
ماہدولت	۲/۸/-	نوبت پنج روزہ	
		امت کی مائیں	

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

مصنف　عبد الوحید خاں

قیمت:۔ مجلد سات روپے آٹھ آنے

نوٹ:۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ جن کتابوں کی قیمتوں کا اندراج نہیں ہے اس کے لئے جوابی کارڈ تحریر فرمائیے۔

منیجر۔ طلوع اسلام پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ۔ کراچی